اشارے منزل کی طرف

دینی فکری واصلاحی مضامین کا مجموعہ

شاہ محمد عثمانی

مانی پبلشنگ ہاؤس

بی-۱۲۱- ذاکرباغ- اوکھلا روڈ نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

مؤلف کے گذشتہ پچاس سالہ دور کے شائع شدہ مضامین
کا انتخاب

اشارے
منزل کی
طرف

(چند دینی، فکری و اصلاحی مضامین اور تربیتی تحریروں کا مجموعہ)

شاہ محمد عثمانی

ناشر

عثمانی پبلشنگ ہاؤس

بی۔ ۱۲۱۔ ذاکر باغ۔ اوکھلا روڈ۔ نئی دہلی ۲۵۔۱۱۰۰

ا

سلسلۂ مطبوعات (۵)

باراول	۱۹۸۶ء
ناشر	عثمانی پبلشنگ ہاؤس
	بی ۱۲۱ر ذاکر باغ۔ اوکھلا روڈ۔ نئی دہلی ۲۵۔
صفحات	۲۰۷
طابع	گرافک آرٹ پرنٹرس۔ گلی قاسم جان۔ دلی ۶۔
باہتمام	امین عثمانی ندوی۔ بی اے۔ بی ایڈ۔
قیمت	۴۰ روپئے

ملنے کے پتے

۱۔ عثمانی پبلشنگ ہاؤس۔ بی ۱۲۱ر ذاکر باغ اوکھلا روڈ۔ نئی دہلی ۲۵

۲۔ دار الغنی۔ شاہ گنج۔ پٹنہ ۶

۳۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵۔

۴۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار۔ دہلی ۶۔

۵۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنس بلڈنگ۔ بمبئی ۴۰۰۰۰۳۔

۶۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونیورسٹی مارکیٹ علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱۔

۷۔ مکتبہ برہان۔ اردو بازار۔ دہلی ۶۔

۸۔ مکتبہ رشیدیہ۔ اردو بازار۔ دہلی ۶۔

فہرست

مصنف کتاب ایک نظر میں

پیدائش اور وطن: ۱۹۱۵ء۔ ضلع گیا۔ بہار۔ قیام حال مکہ معظمہ

تعلیم : جامعہ ملیہ دہلی۔ ہاشمی اسکول گیا۔ کلکتہ اسکول۔ پریسیڈنسی کالج اور بنگا باشی کالج کلکتہ میں تعلیم پائی۔

جنگ آزادی : تحریک آزادی کے سلسلہ میں آزادی سے پہلے شہر گیا میں "جمیعۃ الطلبہ" قائم کی۔ کلکتہ میں "مسلم یوتھ اسمبلی" کی بنیاد ڈالی۔ "مسلم ماس کانٹیکٹ کمیٹی" کی قیادت کی۔ ضلع کلکتہ کی جمیعۃ علماء کی نظامت کے فرائض انجام دیئے کانگریس کے لیڈروں کے ساتھ تحریک آزادی میں کام کیا۔

ملی خدمات : جمیعۃ علماء کلکتہ کے ناظم اور آزادی کے بعد امارت شرعیہ بہار و اڑیسہ کے نائب ناظم رہے۔ پٹنہ کی جمیعۃ علماء کے ناظم مقرر ہوئے۔ بہار کے فساد زدہ علاقوں کا دورہ کیا اور دوسرے ملی اور اجتماعی کام فرض منصبی کے طور پر انجام دیئے۔

صحافت : ایڈیٹر کی حیثیت سے روزنامہ استقلال کلکتہ، روزنامہ الہلال پٹنہ، ہفت روزہ نقیب پھلواری شریف میں کام کیا۔ آزاد ہند کلکتہ اور سنگم پٹنہ سے صحافتی تعلق رہا۔

تصانیف : (۱) "ٹوٹے ہوئے تارے"۔ چار سو صفحات کی اس کتاب میں پچاس سے زیادہ ممتاز شخصیتوں کے تذکرے اور خاکے ہیں۔ (۲) "اشارے منزل کی طرف"۔ مولف کے مختلف مضامین کا مجموعہ ہے۔ (۳) "مبادی سیاسیات اسلامی"۔ (۴) "میلاد کی کتاب"۔

تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "ٹوٹے ہوئے تارے" کا مقدمہ۔

عرضِ مؤلف

میں ۳۲ء سے بلکہ اس سے کچھ پہلے سے اخبارات میں مضامین لکھتا رہا ہوں۔ دو روزناموں استقلال کلکتہ اور الہلال پٹنہ اور ہفتہ وار و پندرہ روزہ نقیب کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیئے ہیں۔ اخبار سنگم میں بھی ایک سال سے کچھ کم عرصہ تک کام کیا ہے۔ بعض دوستوں نے مجھ سے کہا تھا کہ میرے بعض مضامین جو گذشتہ پچاس سال سے زیادہ عرصہ کے اندر شائع ہوئے ہیں اب بھی لوگوں کے لئے مفید ہو سکتے ہیں۔ ان کا مجموعہ کتابی شکل میں مرتب ہونا چاہیئے۔ ان حضرات کی تشویق سے میں نے چاہا کہ اپنے ایسے مضامین جمع کرلوں۔ حالات نے بہت زمانہ تک اس کی اجازت نہ دی۔ اب جبکہ بڑھاپے کی آخری منزلوں سے گذر رہا ہوں میں نے اخبار نقیب اور اخبار سنگم میں شائع شدہ اپنے مضامین میں سے ترسٹھ مضامین کا انتخاب کیا اور انہیں نظر ثانی کے بعد کتابی شکل میں شائع کر رہا ہوں اور اس کتاب کا نام "اشارے — منزل کی طرف" رکھا۔ یہ مضامین انشاء اللہ ذہنی فکری اور تربیتی اعتبار سے مفید ثابت ہوں گے۔

روزنامہ استقلال کلکتہ اور روزنامہ الہلال پٹنہ جن کا میں ایڈیٹر تھا، اور سہ روزہ الہلال پٹنہ جسے میرے بھائی عبدالرحمان مرتب کرتے تھے اور الجمعہ دہلی اور انصاری دہلی میں بھی میرے بہت سے مضامین قابل انتخاب ہیں لیکن ان کی فائلیں حاصل نہ کرسکا۔ اگر ان کی فائلیں مل گئیں تو انشاء اللہ اس کتاب کا دوسرا حصہ بھی شائع ہو جائے گا۔

والحمد للہ رب العلمین والصلوٰۃ والسلام علی سید المرسلین۔

ان جرائد کے پڑھنے والوں کا حلقہ عام مسلمانوں کا حلقہ ہے اس لئے زبان و اسلوب میں اس حلقہ کی رعایت رکھی گئی ہے۔

محمد عثمانی

۶/ ستمبر ۹۴ء

سورۃ الفاتحہ

ہر زمانہ میں اللہ کے بعض بندے ایسے ہوتے ہیں جو اپنے دور کے مروجہ مذاہب سے مطمئن نہیں ہوتے۔ ان کا دل ان مذاہب کے صحیح ہونے کا انکار کرتا ہے۔ وہ اللہ کے وجود کے قائل ہوتے ہیں اور اس کے بھی کہ اس سے ہدایت ملتی ہے۔ کائنات کا ہر ذرہ ان سے کہتا ہے کہ ایک اللہ کی قوت پوری کائنات کو چلا رہی ہے۔ تخلیق، ربوبیت اور ہدایت اسی سے ہے۔ جب قوم کی قوم غیر اللہ کی عبادت کرنے لگتی ہے۔ جب خوبصورت چیزوں، چمکدار ستاروں، محیر العقول اشیاء سے نظریں خیرہ ہونے لگتی ہیں اور کوئی بھی نظر نہیں آتا کہ ان مخلوقات کے آگے جھکا ہوا نہ ہو تو وہ پکار اٹھتے ہیں:

وَلَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْخَاسِرِيْنَ

(اگر میرا رب مجھ کو ہدایت نہیں دے گا تو ضرور میں نقصان اٹھانے والوں میں ہو جاؤں گا)۔

یہی کچھ صورت آج سے چودہ سو برس پہلے عرب کی سرزمین پر بھی پیش آگئی تھی۔ بہت سے لوگ اپنے آبائی مذہب سے بددل تھے۔ کسی نے عیسائی مذہب اختیار کر لیا تھا، کوئی اس پیشین گوئی کے ظہور منتظر تھے کہ ایک نبی آنے والا ہے۔ کسی کو خبر ملتی تھی کہ کسی نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے تو تحقیق حال کے لئے آدمی بھیجتا تھا اور خود بھی آتا اور معلوم کرتا کہ کیا واقعی کوئی نبی ظاہر ہوا ہے؟

ان کا دل کہتا تھا کہ ——— الٰہی! تو نے ہم کو چھوٹے سے بڑا کیا۔ عقل اور سمجھ کو مضبوط اور پختہ کیا، نظروں نے تیری ربوبیت، مالکیت اور رحم و کرم کا

مشاہدہ کر لیا۔ اب یہ آنکھیں اور یہ عقل اس کے لئے تیار نہیں کہ ہم گمراہوں کے اس ہجوم کے ساتھ ہو جائیں جو اس کے چار طرف پھیلے ہوئے ہیں۔ الٰہی! تو ہدایت بھیج اور اپنے بندوں کو بھٹکتا ہوا نہ چھوڑ۔

ان کی انہی آرزوؤں کی ترجمانی قرآن کی سورۃ الفاتحہ میں اس طرح کی گئی ہے:

الحمد للہ رب العالمین	شکر ہے اللہ کا جو سب ہی دنیا کا پالنے والا ہے
الرحمن الرحیم	جو سر تا سر رحم ہے اور جس سے رحم کے فعل کا صدور بھی ہوتا ہے۔
مالک یوم الدین	جزا و سزا کے ایک ایسے دن کو وجود میں لانے والا ہے جب اس کے سوا کسی کا اختیار نہیں چلے گا۔
ایاک نعبد و ایاک نستعین	ہم آپ کے بندے ہیں اور ہدایت اور مغفرت کے لئے آپ کی مدد چاہتے ہیں۔
اھدنا الصراط المستقیم	سیدھا اور صحیح راستہ کیا ہے اس طرف لے چل۔
صراط الذین انعمت علیھم	وہ راستہ کہ اس پر لوگ چلے تو تیرے انعام کے مستحق ٹھہرے۔
غیر المغضوب علیھم ولا الضالین	وہ راستہ نہیں جس پر چلنے والے تیرے غضب اور غصہ میں پڑ گئے اور جو بھٹکتے پھر رہے ہیں ان کے ساتھ بھی نہ کر۔

اللہ نے سچے دلوں کی یہ پکار سن لی۔ اس نے نبی بھیجا، وحی بھیجی اور سورۃ الفاتحہ کے معاً بعد یہ اعلان کیا گیا:

ذلک الکتاب لا ریب فیہ ھدی للمتقین	یہی وہ کتاب ہے جو بلا شک ان لوگوں کے لئے ہدایت بن کر آئی ہے جو اپنے انجام سے خائف اور جو صلاح و فلاح کی راہ معلوم کرنے کے لئے بے تاب تھے۔

مسلمان روزانہ پانچ وقت اور پانچ وقت کی ہر رکعت میں اس سورہ الفاتحہ کو پڑھتے ہیں جس میں فطرتِ انسانی کی اس طلب کو دہرایا گیا ہے۔ وہ اپنے اندر اس عزم کو بیدار کرتے ہیں کہ جو چیز ان کی طلب پر آئی ہے اس کو مضبوطی سے پکڑ لیں۔

واعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا

(اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لو اور اس کو چھوڑ کر علٰحدہ علٰحدہ نہ ہو جاؤ)

یہ قرآن کا انوکھا طریقہ ہے کہ اس نے وجہ نزول قرآن کو دعا کی شکل میں پیش کیا ہے۔ دعا وہ جس کی طرف صالح انسان کے قلب کی دھڑکن اشارہ کر رہی ہے۔ دعا وہ جو ان تمام انسانوں کی زبان پر بے اختیارانہ آجاتی ہے جو اندھے اور بہرے بن کر دنیا میں زندگی نہیں گذارتے بلکہ انہیں اپنے انجام اور اپنے مستقبل کی فکر پریشان کرتی رہتی ہے جو یہ جاننا چاہتے ہیں کہ اس دنیا میں اس دنیا کے مالک کی مرضی کیا ہے۔ وہ کس بات سے خوش ہوتا ہے اور کس بات سے ناراض ہوتا ہے۔

یہ سب پودا انہی کی لگائی ہوئی ہے

ربیع الاول کے مہینہ میں اس جلیل القدر شخصیت کی پیدائش ہوئی جس نے نہ صرف اپنے ہی عہد میں اصلاح وانقلاب کا کام بدرجۂ کمال انجام دیا بلکہ اپنے پاکباز جانشینوں کے ذریعہ دنیا کے ہر ملک اور ہر قوم کو سدھارتا اور بناتا اور ترقی کے میدان میں آگے بڑھاتا رہا۔ اس کا پیغام، اس کی تعلیم اور اس کے عمل کے نمونے بھی بڑی بڑی گتھیوں کو سلجھانے میں شعوری یا غیر شعوری طور پر معاون ہوتے رہتے ہیں۔

جب سرور کائناتؐ مکہ میں پکار کر کہہ رہے تھے کہ اس دن سے ڈرو جس دن کوئی کسی کے کام نہ آئے گا سب کو اپنا حسن عمل ہی کام دے گا اور یہ کہ خدا کی خدائی میں کسی کو شریک نہ کرو تو مکہ والے اس دعوت کی افادیت کو سمجھ نہ سکے۔ وہ برہم ہو گئے۔ انہیں چڑھ ہوئی۔ وہ اذیتیں دینے لگے اور پھر آپ کے قتل پر آمادہ ہو گئے۔ باطل پر چلنے والے، شرک میں مبتلا، انسانی جانوں کو ارزاں سمجھتے ہی ہیں۔ مجبوراً حضورؐ نے وطن چھوڑا اور مدینہ کی راہ لی۔

رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ آئے تو انتقام کے جذبہ سے بالکل خالی تھے۔ مسجد بنوائی۔ مہاجرین اور انصار میں مواخات قائم کی۔ یہودیوں سے دفاعی معاہدہ کیا۔ اسلام کی تبلیغ کی، لیکن یہ کوشش نہیں کی کہ کفار مکہ کو روندڈالنے کے لئے کوئی لشکر جرار تیار کریں۔ اس خطرہ کو دور کرنے کے لئے کہ کفار مکہ مدینہ پر چڑھائی نہ کریں۔ مناسب معلوم ہوا کہ ان کو کچھ مرعوب کر دیا جائے۔ لیکن ایسی کارروائی کئی اہم جنگوں کی محرک ہوئی۔ بہتر اہم

نتائج کے اعتبار سے، ورنہ دنیا نے جو ہولناک جنگیں دیکھی ہیں اس اعتبار سے رسول صلعم کے زمانہ کی کوئی جنگ بھی جنگ نہ تھی۔ بہر حال کفار مکہ نے مدینہ پر پے در پے کئی حملے کئے لیکن ان کو شکست ہوئی۔ اسلام تو امن اور بھائی چارگی کا پیغام لے کر آیا تھا۔ لڑائی اس کا مقصد نہ تھا اس لئے جب کفار مکہ نے صلح پر آمادگی ظاہر کی تو آپ نے صلح فرمالی اور دشمنوں کے بعض غیر منصفانہ مطالبوں کو بھی قبول فرمالیا یعنی بظاہر جھک کر صلح کر لی کیونکہ اسلامی نقطۂ نظر سے صلح میں خیر اور بھلائی ہے اور صلح میں خیر اور بھلائی ثابت ہوئی۔

بدر میں کل تین سو تیرہ مسلمانوں کا آنا اور بے ساز و ساماں آنا بتاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جدال و قتال نہیں چاہتے تھے اور جدال و قتال تو ابو سفیان رئیس مکہ بھی نہیں چاہتے تھے۔ انہوں نے اپنی قوم کو کہلا بھیجا تھا کہ واپس چلے آؤ، قافلہ شام سے تجارت کا مال لے کر بحفاظت واپس آگیا ہے لیکن ابو جہل جنگ کے لئے اڑا ہوا تھا۔ اس نے سوچا ہوگا کہ مسلمان بہت قلیل تعداد میں ہیں ان کا صفایا کر دیا جائے تاکہ شام سے تجارت کا راستہ ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو جائے۔ مسلمان مکہ سے ظلم و ستم سہہ سہہ کر گھر بار چھوڑ کر مدینہ چلے آئے تھے اس لئے ہمیشہ خطرہ انتقام کا رہتا تھا لیکن جب جنگ ہو ہی گئی تو یہ قلیل التعداد مسلمان غالب آگئے۔ کفار کچھ مارے گئے، کچھ بھاگے، کچھ گرفتار ہوئے۔ لڑائی سے تو لڑائی پیدا ہوتی ہے۔ لڑائی صلح و محبت اور امن و چین کی راہ پر نہیں لے جاتی ہے۔ جو ہار گئے وہ ہزیمت کی شرمندگی مٹانے اور نقصان کا انتقام لینے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے اور تین ہزار کی جماعت مدینہ کی طرف بڑھی۔ رسالت پناہ مسلمانوں کے امیر و مطاع تھے۔ سرعت فیصلہ و صحت فیصلہ کی استعداد اول تو خود ہی رکھتے تھے پھر وحی الٰہی کے ذریعہ ہدایت و رہنمائی میں تاخیر کب کی جاتی۔ کوئی ضرورت مسلمانوں کے مشورہ کی نہ تھی اور مشورہ کیا تھا تو قبول کرنے پر مجبور نہ تھے، لیکن حضور کو تو اپنی قوم کو جمہوریت کی طرف لے جانا تھا اس لئے مسلمانوں سے مشورہ کیا اور جو مشورہ آپ کو آپ کی رائے کے خلاف ملا اس کو بھی قبول کیا اور اس کی پابندی کی اور کرائی۔

حضور کی اپنی رائے تھی کہ مدینہ میں رہ کر ہی مقابلہ کیا جائے لیکن نوجوانوں کا اصرار تھا کہ باہر ہی نکل کر قوت آزمائی کی جائے۔ حضور نے اپنی رائے واپس لی اور وہ جوانوں کی رائے قبول و منظور فرما کر اور مسلح ہو کر باہر نکلے۔ اصرار کرنے والے شرمندہ تھے کہ حضور کی رائے پر اپنی رائے کو ترجیح دے دی۔ عرض کیا کہ حضور ہی کی رائے پر عمل ہو۔ یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ مطیعوں کا جم غفیر امیر و مطاع کی رائے کے آگے اپنی کچھ رائے رکھتا ہی کب ہے۔ لیکن معلم انسانیت فیصلہ بدلنے کی اجازت نہیں دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اسلحہ پہن کر اسلحہ اتارا نہیں جا سکتا، نبی کے لئے یہ جائز نہیں۔

جب ساری دنیا جمہوریت سے نا آشنا تھی، مسلمانوں کے اس امیر نے جمہور کی رائے کو وقعت و اہمیت دے کر اور ناقابل تنسیخ قرار دے کر ایک نئی منزل کی طرف بڑھنے کا اشارہ کیا۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

فوج کی کمان بڑے فخر و غرور کی بات سمجھی جاتی تھی۔ بڑے عالی نسب اشخاص کو چھوڑ کر آج تک چھوٹوں کی نظر انتخاب کس کی پڑی ہے۔ حضور نے روم کے مقابلہ میں ایک فوج تیار کی کہ وہ شام پہنچ کر وہ سلطنت روما پر مسلمانوں کی ہیبت کا سکہ بٹھا دے اور اس کی ہمت نہ ہو کہ وہ حجاز کی طرف رخ کرے۔ کمان تفویض ہوئی حضرت اسامہ بن زید کو۔ حضور تو چل بسے۔ حضرت ابوبکر کے ذمہ فوج کا روانہ کرنا رہا۔ کراہیت اور ناپسندیدگی کے اظہار سے لوگ باز نہیں آئے۔ بڑے بڑے سرداران قریش کی موجودگی میں یہ کیا ایک غلام زادہ کو فوج کی کمان دی جا رہی ہے۔ لیکن رسول کا صدیق حمیم رفیق غار خلیفہ برحق یہ کب برداشت کرتا۔ اس نے اسامہ بن زید کو ہی سالار فوج بنائے رکھا اور انہی کی قیادت میں فوج بھیجی۔ چلئے امامت حضرت ابوبکر کی اور کمان اسامہ بن زید کی سول اور فوجی دونوں سرداریاں وراثت کے رواج کے خلاف۔

یہی وہ نشانِ منزل تھے کہ صحابہ کسی موروثی خلافت کے تصور کی حمایت نہیں کر سکے۔ الاماشاء اللہ۔ جب حضرت علی کے بعد امام حسن مسند خلافت پر متمکن ہوئے تو ان کے لئے

صرف ایک راہ کھلی ہوئی تھی اور وہ یہ کہ وہ حضرت امیر معاویہ کے حق میں دست بردار ہوجائیں مسلمانوں کا غالب حصہ جن کے ساتھ ہو گیا تھا۔ اس طرح انہوں نے مسلمانوں کی باہمی خونریزی کا سلسلہ ختم کیا اور جب یزید کی خلافت کا اعلان ہوا تو حضرت عبداللہ بن عمر نے ان کی خلافت کو تو تسلیم کیا لیکن کہا : "یہ قیصر و کسریٰ کی سنت ہے۔"

یورپ نے یہ آواز سنی اور قیصر کی سنت کو اپنے یہاں بھی زیادہ دنوں چلنے نہیں دیا جب اسلام پہنچا تو دانشمند مسیحیوں نے باوجود اس جنگ و جدل کے جو مسلمانوں سے تھی، اسلام کی اچھی باتوں کا اعتراف کیا اور آہستہ آہستہ اس کی بعض باتوں کو اپنایا۔ اسلام ہی ایک مذہب ہے جسے عوامی ہونے کا شرف حاصل ہے۔ چنانچہ یورپ میں پاپائے اعظم کے قدموں تلے کچلے ہوئے عوام اسلام کا نمونہ پاکر پاپائے اعظم کے خلاف بغاوت پر آمادہ ہو گئے اور جرمنی سے مارٹن لوتھر نے آواز دی :

"مذہب پر پاپا کا اجارہ صحیح نہیں۔ انجیل ہر شخص پڑھے، ہر شخص سمجھے اور ہر شخص اس پر عمل کرے۔"

جس طرح قرآن پڑھنے سننے اور اس پر عمل کرنے کا حق ہر فرد رکھتا ہے، وہ کسی پاپا اور کسی برہمن کا محتاج نہیں۔

جب پاپا کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی اور مسیحیت کو کلیسا سے آزادی ملی تو چونکہ مذہب کا اثر زندگی کے تمام شعبوں پر پڑتا ہے اور چونکہ رسول عربی کی جمہوری سیاست کے نقوش موجود تھے انہوں نے اپنا کام کیا اور فرانس کا مفکر روسو ان نقوش سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور اس نے کہا :

"شہنشاہیت بے حقیقت ہے۔ جمہوریت حق ہے اور اصل طاقت جمہور کی ہے۔"

خود مسلمانوں کی شہنشاہیت نے رسول عربی کی جمہوریت کے خدوخال پر پردہ ڈال دیا تھا لیکن جیسا کہ کہا گیا کہ مسلمان اپنا فرض ادا نہ کریں گے تو اللہ تعالیٰ ایک نئی قوم پیدا کرے گا جن سے منشاء الٰہی پورا ہوگا، یورپ کی قوم اٹھی اور اس نے ساری دنیا

میں جمہوریت کا نقارہ پیٹ دیا۔

ہندوستان اس راہ میں بہت پیچھے رہا۔ ایک زمانہ تھا کہ یہاں علوم وفنون نے بڑی ترقی کی تھی اور اس نے سارے جہاں کو علم وہنر دیا تھا۔ اس کی ایجاد کی ہوئی گنتیاں ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ وہاں سے نکل کر مشرق وسطیٰ ہوتی ہوئی یورپ و امریکہ پہنچیں آج ہم جن کو عربی اور انگریزی گنتیاں کہتے ہیں وہ حقیقت میں ہندوستان ہی کی ایجاد کردہ ہیں۔ لیکن ہندو شدید قسم کے طبقاتی اور ذات پات کے مرض میں مبتلا ہو گئے اور اس نے ان کو دنیا کی سب سے پچھلی صف میں کھڑا کر دیا۔ لیکن اب یہ بھی بیدار ہو رہے ہیں۔ فرنگیوں نے ان کو جمہوریت کی راہ بتائی ہے۔ اس طرف ان کی توجہ نہ ہوتی، اگر مسلمان آٹھ سو برس اس ملک میں اس طرح رہے نہ ہوتے۔ مسلمانوں میں نہ چھوت چھات ہے اور نہ الگ الگ عبادت کا دستور، سب چھوٹے بڑے، امیر و غریب ایک ہی صف میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ان کو کسی غلام خاندان کے افراد کو بادشاہ مان لینے سے بھی عار نہیں تھا۔

یہ مضمون نامکمل رہے گا اگر ناظرین مشہور انقلابی اور آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر اعلیٰ بہار سے متعلق یہ خبر نہ پڑھ لیں:

پٹنہ میں بہار اسٹیٹ شیعہ کانفرنس منعقد ہوئی۔ صوبہ بہار کے وزیر اعلیٰ سری کرشن سنہا نے اس کانفرنس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

"ہزاروں برس پہلے کی تاریخ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک آدمی لاکھوں آدمیوں پر فرمانروائی کرتا تھا مگر آہستہ آہستہ تلخ تجربوں کے بعد دنیا اس نتیجہ پر پہنچی کہ دنیا کو ایسی جگہ بنانے کے لئے جیسی کہ خود اس کے خالق کی خواہش ہے، یہ ضروری ہے کہ خدا اور بندے میں براہ راست تعلق ہو۔"

(وزیر اعلیٰ نے کہا کہ) "میں یہ اعتراف کرتا ہوں اور اس میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتا کہ انسانیت طویل عرصہ سے ظلم و ناانصافی کی زنجیروں

میں جکڑی ہوئی تھی۔ اسے توڑنے میں اسلام نے بڑا نمایاں کردار انجام دیا ہے۔" (انہوں نے کہا کہ) "رومن تہذیب کے زوال کے بعد یورپ میں جب ہر چہار طرف جہالت، لاعلمی اور پسماندگی کی تاریکیاں چھائی ہوئی تھیں اس وقت عرب کے صحراؤں میں پیغمبر اسلام حضرت محمد (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) پیدا ہوئے انہوں نے انسانوں اور انسانوں کے درمیان تمام امتیازات کو ختم کر کے اخوت، مساوات، رواداری کی حمایت کی اور ہر انسان کو اس کے بنیادی حقوق دینے کی آواز بلند کی۔" (وزیر اعلیٰ نے کہا کہ) "مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی جھجک نہیں کہ آج دنیا میں جمہوریت کے جو نعرے بلند ہو رہے ہیں اس جمہوریت کی سب سے پہلی گونج عرب کے ریگستانوں میں سنی گئی تھی۔ یہ گونج پیغمبر اسلام کے پیش کردہ اصولوں اور افکار کی تھی۔" (وزیر اعلیٰ نے یاد دلایا) "انسانیت کو سربلند کرنے کے لئے پیغمبر اسلام کو کیسے کیسے کٹھن مرحلوں سے گزرنا پڑا تھا، آج ساری دنیا اسلام کی افادیت کا لوہا مانتی ہے مگر اس وقت پیغمبر اسلام کو مکہ اور مدینہ میں کن کن مخالفتوں اور کٹھنائیوں کا سامنا کرنا پڑا تھا، اس کی تفصیل سے آپ خود واقف ہیں۔ اس وقت پیغمبر اسلام نے سچائی کو سربلند کرنے کے لئے جو مصائب برداشت کیے، جن مشکلوں اور دشواریوں کا خندہ پیشانی سے سامنا کیا انہی کی بدولت آج دنیا اسلام کی سچائی سے روشناس ہو سکی ہے۔"

بہار اب جو دنیا میں آئی ہوئی ہے
یہ سب پودا انہی کی لگائی ہوئی ہے

خلافت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ــــ دو نقطہ ہائے نظر

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہوا تو خلافت کا مسئلہ مسلمانوں کے سامنے آیا اور دو طرح کے افکار کا تصادم سامنے آیا۔

پہلا خیال یہ تھا کہ رسول کی خلافت موروثی اور خاندانی ہونی چاہیے۔ یہ خیال خاندان بنی ہاشم کے حامیوں کا تھا۔ رسول کی اس بارے میں کوئی ہدایت نہ تھی۔ جس بارے میں کوئی حکم نہ ہو اس بارے میں نظیر ہی سے کام لیا جا سکتا ہے اور نظیر جمہوریت کی اس وقت کوئی پیش نہیں کی جا سکتی تھی۔ اس دور میں اور اس سے پہلے جہاں کہیں بھی کوئی نظام تھا وہاں سرداری اور ریاست موروثی ہی کا نظام تھا۔ خاندانی بادشاہت کے سوا کچھ سوچنا مشکل تھا۔ قرآن میں حضرت سلیمان نبی علیہ السلام کی مثال موجود تھی جو بادشاہ تھے۔ حبش کا بادشاہ مسلمان ہوا تو حضور نے بادشاہت سے الگ ہونے کا کوئی حکم اس کو نہیں دیا اس لئے بنی ہاشم میں کچھ لوگوں نے اگر ایسا سوچا تو یہ کتاب وسنت کی مخالفت نہ تھی۔ ان کو ایسا سوچنے کا اور اجتہاد کرنے کا حق تھا۔

دوسرا خیال یہ تھا کہ خلافت موروثی اور خاندانی نہ ہو بلکہ تقوٰی، خدمت اور صلاحیت کو معیار بنایا جائے۔ تاریخ کے پورے دور میں اور آج بھی مسلمانوں کی اکثریت اس خیال کے ساتھ ہے۔ قریش جن کے ہاتھوں میں عربوں کی سیادت تھی تاجر پیشہ تھے اور تجارت کے سلسلہ میں شام و ایران کی سیاحت کرتے تھے۔ موروثی بادشاہی کے نقصانات کا وہ مشاہدہ کرتے رہتے تھے اس لئے ویسے بھی ان کا رجحان موروثی خلافت کی طرف نہ تھا دوسرے حضور اکرم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مزاج بھی مسلمانوں کا جمہوری بنا دیا تھا۔ آپ اکثر امور میں جن کا تعلق وحی سے نہ ہوتا، صحابہ سے مشورے کرتے

تھے۔ ان مشوروں میں اپنی رائے پر صحابہ کی رائے کو ترجیح دیتے تھے۔ بدر، احد اور خندق کی جنگوں کے موقعوں پر ایسی مثالیں ملتی ہیں۔ ایک بار حضور جبکہ حضرت معاذ کو یمن کا گورنر بنا کر بھیج رہے تھے، بعض صحابہ کو جمع کر کے مشورہ فرمایا تو کہا "میری انفرادی رائے تم لوگوں کی ایک ایک رائے کے برابر ہے۔" پھر سماجی معاملات میں برابری پر زور، تکبر کی مذمت تقویٰ کے سوا تمام بنیادوں پر افضلیت کی مخالفت، اور یہ بتانا کہ عربی کو عجمی اور عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت نہیں، اور یہ بتانا کہ تم پر حبشی غلام بھی امیر بنا دیا جائے تو اس کی اطاعت کرو، سب صورتیں موروثی خلافت اور خاندانی بادشاہت کے تصور کو مٹانے والی تھیں۔ پھر مرض الموت میں امامت حضرت ابوبکر صدیق کو سونپنا بھی بنی ہاشم کے دعویٰ ارث کے خلاف ایک ثبوت تھا۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مساوات کی حمایت میں اور موروثی خلافت کی مخالفت میں کیسا مزاج تیار ہو گیا تھا۔

جمہور میں انصار تو یہاں تک گئے کہ قریش میں سے کسی کی امامت تسلیم کرنے کو تیار نہ تھے لیکن حضرت ابوبکر کی شخصی عظمت ان کا حضور کے مرض الموت کے وقت نماز کی امامت کرنا اور پھر ارشاد نبوی صلعم الائمۃ من القریش کا سنایا جانا، یہ سب موثر ہوئے اور انصار نے اپنی رائے بدل دی۔

علماء کی ایک جماعت الائمۃ من القریش کو حکم مانتی ہے لیکن واقعات سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔ انصار کے سامنے یہ حدیث پیش کی گئی تو حضرت عمر اس وقت وہاں موجود تھے یعنی ان کے سامنے یہ حدیث دہرائی گئی لیکن اس کے باوجود حضرت عمر نے اپنی شہادت کے وقت یہ فرمایا کہ اگر حضرت حذیفہ کے غلام حضرت سالم زندہ ہوتے تو وہ ان کو خلیفہ بناتے حالانکہ حضرت سالم قریشی نہ تھے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ حدیث صرف پیشین گوئی تھی نہ کہ حکم۔[۱]

---

[۱] حضرت عمر کے اس ارشاد میں ایک اور فکر کی طرف رہنمائی ملتی ہے۔ حضرت عمر کی خلافت تک فتوحات کا سلسلہ دور دور تک پہنچ گیا تھا۔ نو مسلموں کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی۔ غلاموں کی تعداد میں بھی اضافہ ہو

بہر حال جمہور مسلمانوں کے اس فیصلہ کو بنی ہاشم نے مان لیا کہ خلافت موروثی نہ ہو چھ ماہ کے بعد حضرت علی نے ابو بکر کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ تاخیر کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ حضرت فاطمہ بیمار تھیں اور حضرت علی ان کی تیمارداری فرما رہے تھے۔

بنی امیہ کے حامی کہتے ہیں کہ حضرت ابو بکر کا پورا عہد خلافت بنی ہاشم کے حامیوں کے زریں کارناموں سے خالی ہے۔ ان کے زمانہ کی اور ان کے بعد کی فتوحات میں حضرت خالد اور حضرت ابو عبیدہ حضرت سعد بن وقاص کے نام چمک رہے ہیں۔ حضرت عمرو بن العاص اور بنی امیہ کے بہادروں کا ذکر آتا ہے۔ عکرمہ بن ابو جہل کے خون سے شجر اسلام کی آبیاری دکھائی دیتی ہے۔ لیکن کسی جگہ تلوار ذوالفقار بے نیام دکھائی نہیں دیتی۔

حضرت عمر سے ان کے عہد خلافت میں حضرت علی اور حضرات حسنین سے تعلقات قوی تر ہو گئے ہیں۔ حضرت فاطمہ کی بیٹی حضرت عمر کے عقد میں آ گئی تھیں۔ باغ فدک کی دیکھ بھال بھی حضرت علی کے سپرد ہو گئی تھی۔ حضرت علی خلافت کے مشوروں میں شریک رہتے تھے۔ ان کا مشورہ موثر ہوتا تھا لیکن وہ کسی جنگ میں نہیں شریک ہوئے۔ حضرت عثمان کے عہد میں بھی نہیں شریک ہوئے۔ اسکے جواب میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ حضرت فاطمہ کے انتقال کے بعد حضرت علی نے پے در پے کئی شادیاں کیں اس لئے ان کی گھریلو ذمہ داریاں بہت بڑھ گئی ہوں گی۔ حضرت عثمان کے عہد سے حضرت امام حسن کا شباب شروع ہوتا ہے۔ ان کی خاندانی عظمت کی وجہ سے لوگ ان کو اپنی بیٹیاں بہت دیتے تھے اس لئے انہوں نے کئی شادیاں کیں۔ ظاہر ہے ان پر بھی گھر کا بوجھ بہت زیادہ ہو گیا ہو گا۔ دوسری

گیا تھا۔ ان مسلموں اور غلاموں کو احساس تھا کہ رؤسائے عرب کے مقابلہ میں ان کو کمتر سمجھا جاتا ہے۔ حضرت عمر پر وہ حملہ بھی ایک غلام نے کیا تھا جس سے وہ جانبر نہ ہو سکے۔ حضرت عمر اس صورتحال کو بھانپ گئے تھے۔ اس لئے انہوں نے ایک بات تو یہ کہی کہ اگر آئندہ سال زندہ رہا تو مال غنیمت کی غیر مساوی تقسیم کو ختم کر دیا جائے گا۔ دوسرے یہ اشارہ بھی کر دیا کہ وقت آ گیا ہے کہ کسی غلام کو مسند خلافت پر بیٹھا دیا جائے (محمد عثمانی)۔

طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مسلمانوں کی تعداد بہت تھوڑی تھی۔ جنگوں کے لئے ہر مسلمان کا کوچ کرنا بہت ضروری ہو جاتا تھا۔ جو جتنا زیادہ قریب ہوتا اتنا ہی زیادہ اس کو آگے بڑھنا پڑتا۔ بنی ہاشم مسلمان بھی تھے الاماشاء اللہ اور خاندان نبوت سے بھی تعلق رکھتے تھے اس لئے ان کا جی جان سے لڑائیوں میں کود پڑنا قدرتی بات تھی۔ حضرت ابوبکر وعمر وعثمان رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں مسلمانوں کی تعداد بہت بڑھ گئی اس لئے لڑنے والوں کی بھی کمی نہیں تھی۔ بنی امیہ نے رسول اللہ صلعم کے وقت میں غزوات میں بہت کم حصہ لیا تھا اس لئے ان کی خواہش تھی کہ وہ اس کمی کو پورا کریں اور اسلام کے لئے پروانہ وار نثار ہو کر ثابت کریں کہ وہ بھی اللہ ورسول کی محبت میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ گرچہ حضرت عمران کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے لیکن وہ سر ہتھیلیوں پر لئے پھرتے تھے۔ حضرت ابوسفیان کے بیٹے یزید شام کے محاذ پر زخموں سے چور حضرت ابوعبیدہ کے زانو پر سر رکھے دم توڑتے ہیں اس وقت وہ کہتے ہیں کہ عمر سمجھتے ہیں ہم اسلام پر جان فدا نہیں کر سکتے۔ وہ یہاں پر ہوتے تو دیکھتے کہ ابن ابوسفیان اسلام پر قربان ہو گیا۔

اسلام کے لئے میدان جنگ میں بنی ہاشم اپنا کارنامہ دکھا چکے تھے، اب وقت آگیا تھا کہ بنی امیہ اسلام کے لئے جو کچھ کر سکیں کریں، اور انہوں نے قابل تعریف حد تک خدمات انجام دیں۔

حضرت عثمان خلیفہ ہوئے تو بنی ہاشم کی موروثی خلافت کے نظریہ کے حامی زیادہ دنوں تک اس صورتحال کو برداشت نہ کر سکے۔ سازشیں ہوئیں، بغاوت ہوئی اور خلیفہ ثالث حضرت عثمان کو جام شہادت نوش کرنا پڑا۔ باغیوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ موروثی خلافت کا اصول اب منوایا گیا تو یہ فیصلہ بنی امیہ کے حق میں جائے گا۔ یہ کامیابی ان کے لئے نہیں رہو گی۔ اب موروثی خلافت کا مطلب یہی ہوگا کہ حضرت عثمان کے خاندان کا کوئی آدمی ہو چنانچہ حضرت علی خلیفہ ہوئے تو اس دور کی امت ان کی خلافت پر جمع نہ ہوئی، خانہ جنگی شروع ہو گئی یہاں تک کہ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ حضرت امیر معاویہ کے حق خلافت سے دست بردار ہو گئے اور امت ان پر جمع ہو گئی۔ اسطرح

بنی امیہ میں خلافت وحکومت موروثی بن گئی لیکن اس موروثی نظام کی تحریک بہت پہلے سے بنی ہاشم نے چلا رکھی تھی۔

بنی ہاشم کی خلافت کے حامیوں کی ناکامی کی ایک اور وجہ بھی تھی۔ جیسا کہ عرض کیا گیا، عربوں کی سیادت قریش کے ہاتھوں میں رہی تھی۔ قریش کی ایک شاخ بنی ہاشم کے ذمہ خانۂ کعبہ کی خدمت اور حاجیوں کو آرام پہنچانا تھا۔ یعنی مذہبی کام ان کے ذمہ تھا۔ دوسری شاخ بنی امیہ کے ذمہ سیاسی استحکام اور جنگوں کی قیادت تھی۔ زمانۂ جاہلیت میں حرب بن امیہ نے اپنا سیاسی اثر ورسوخ قائم کر لیا تھا اور نسلاً بعد نسل اسی خاندان کا سیاسی اقتدار چلا آرہا تھا۔ اس طرح یہ خیال عام ہو گیا تھا کہ سیاسی صلاحیت بنی امیہ ہی میں ہے۔ اور بنی ہاشم مذہبی امور کو ہی انجام دے سکتے ہیں۔ تمام عرب دیر سویر رسول اللہ صلعم کی نبوت پر جمع ہو گئے تھے۔ اگر حضور صلعم وصیت فرما دیتے کہ خلافت حضرت علی کے حوالہ کی جائے تب تو تاریخ کا رخ دوسرا ہوتا لیکن نہ حضور نے ایسی وصیت فرمائی نہ حضرت علی حضور سے اس طرح کی فرمائش کر سکے جس کا مشورہ حضرت عباس نے ان کو دیا تھا۔ رسول اکرم سے قربت رکھنے کی وجہ سے حضرت ابوبکر وعمر خلیفہ ہو گئے لیکن ان کے زمانہ میں اور خود رسول اللہ صلعم کے زمانہ میں کلیدی عہدوں پر بنی امیہ فائز رہے اس نے اس خیال کو عربوں میں محو نہیں کیا کہ سیاسی امور میں بنی امیہ ہی بہتر رہیں گے۔ اس کو آج کل کے زمانہ میں اس طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ انگریزوں کے پورے دور میں ہندوپاک میں حکومت کے عہدوں پر انگریزی پڑھے لکھے لوگ فائز رہے۔ علماء دین کا کام تبلیغ وارشاد رہا نتیجہ یہ ہوا کہ عام مسلمان یہی سمجھتے ہیں کہ سیاسی کام انگریزی پڑھے لکھے لوگ ہی سمجھ سکتے ہیں علماء دین کو اس سے کوئی تعلق نہیں۔ ہندوستان میں مولانا آزاد، مولانا حفظ الرحمٰن، اور جمعیۃ العلماء ہند کے دوسرے ذمہ داروں کی وجہ سے جو حکومت کے عہدوں پر فائز ہو گئے، یہ تصور ذرا کمزور پڑا ہے لیکن پاکستان میں تو اب بھی یہ تصور بہت مضبوط ہے۔

بہر حال بنی ہاشم کی خلافت کے حامیوں کے اصرار کا یہ ردعمل ہوا کہ بنی امیہ کی خاندانی حکومت قائم ہو گئی۔ جب امت میں انتشار ہو، سمع وطاعت کے لئے کوئی تیار

نہ ہو، جس کی ہر طرح کے نظامِ حکومت میں ضرورت ہوتی ہے، جب بات بات پر تلواریں میان سے نکل آتی ہوں تو بجز آمرانہ نظامِ حکومت کے اور کوئی صورت قابلِ عمل بھی نہیں ہوتی۔ چنانچہ آمرانہ نظامِ حکومت کا قیام عمل میں آگیا جو عربوں میں سیاسی دانشمند سمجھے جاتے تھے۔ انہوں نے عنانِ حکومت ہاتھوں میں لی۔ اگر حضرت عثمان کے وقت میں بنی ہاشم کی موروثی حکومت کے لئے کوششیں نہ ہوتیں تو بہت ممکن تھا کہ حضرت ابوبکر نے ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم کی بنیاد پر جو غیر موروثی خدمتی حکومت قائم کی تھی اور جس میں عوام یہ سمجھتے تھے کہ خلیفہ کو اس کی غلطیوں پر ٹوکیں اور کہیں کہ تو عدل پر نہیں تو تیری اطاعت بھی واجب نہیں، وہ نظامِ حکومت کچھ عرصہ اور چلتا اور جمہوری نظام کی بنیاد اور استوار ہوتی۔

بنی امیہ کی موروثی حکومت کا قائم ہونا بظاہر بنی ہاشم کی موروثی حکومت قائم کرنے کی خواہش رکھنے والوں کی شکست تھی۔ لیکن درحقیقت یہ موروثی نظام پسند کرنے والوں کی فتح تھی اور جمہوریت پسندوں کی شکست۔ انہوں نے اصولاً یہ بات منوالی کہ حکومت موروثی ہونی چاہیئے۔ پھر تاریخ کے پورے دور میں موروثی حکومتیں ہی چلیں۔ ابتداءً سو برس تک بنی امیہ حکومت پر فائز رہے اور بنی ہاشم کے حامی اپنی جد و جہد جاری رکھے رہے یہاں تک کہ بنی عباس کی اور بنی فاطمہ کی حکومتیں قائم ہوئیں لیکن اس وقت بھی مسلمانوں کی اکثریت کا عقیدہ یہی ہے کہ حضور اکرم صلعم کے پہلے خلیفہ ابوبکر، دوسرے عمر تیسرے عثمان اور چوتھے علی ہیں اور سب برحق ہیں اور سب نے منشائے نبوی کے مطابق حکومت چلائی اور یہ کہ اسلام کا نظامِ حکومت موروثی نہیں بلکہ جمہوری ہے۔

یہ تو خیال کے تصادم کی بات تھی۔ سوال یہ ہے کہ ہم دنیا کو اسلام کی تاریخ سے کیا دے سکتے ہیں۔ موجودہ جمہوریت کی خواہش مند دنیا کو ہم حضور صلعم کا عدل و مساوات اور حضرت ابوبکر کی بنائی ہوئی غیر موروثی خدمتی حکومت کا نمونہ ہی دے سکتے ہیں یعنی ایسی حکومت جو خدا اور اس کے بندوں، دونوں کے سامنے جواب دہ تھی، جس کا نظام آمرانہ اور مستبدانہ نہ تھا۔

تاریخ اسلام کا طالب علم دو شخصیتوں کو فراموش نہیں کر سکتا۔ ایک حضرت ابو بکرؓ کو جنہوں نے حضورؐ کے انتقال کے بعد حضور کی امت کو اپنے گرد جمع کر لیا اور ایسی حکومت کی بنیاد رکھی جس کی مثال نہیں مل سکتی۔ دوسرے امام حسن کو جن کے سرعت فیصلہ نے مسلمانوں کی باہمی خوں ریزی کا سلسلہ ختم کر دیا اور امت کو امیر معاویہ کے گرد جمع ہو جانے دیا۔ اسلام کی اولین تاریخ میں یہ دونوں کردار اتحاد اور یکجہتی کی علامت ہیں۔

اسلام کا نظام سیاست

حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب نبوت سے سرفراز ہوئے تو آپ نے اعلان فرمایا "آمنوا باللہ واطیعونی" اللہ پر ایمان لاؤ اور میری اطاعت کرو۔ مکہ کی قدیم لیڈرشپ کے مقابلہ میں اس نئے نظام اطاعت کا قیام اہل باطل کو شاق گذرا۔ ابولہب جو خانۂ کعبہ کا متولی تھا، مخالفت میں کمربستہ ہوا لیکن فرعون کے گھر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا وجود جس طرح کمزوروں اور لاچاروں کے لئے پیامِ راحت و توانائی تھا اور فرعون کے لئے تباہی و بربادی کا پیش خیمہ، اسی طرح ابولہب کا یتیم بھتیجا ضعیفوں اور مجبوروں کے لئے سہارا بن کر سنِ شعور کو پہنچا اور ابولہب اور اس کی حشمت پر بجلی بن کر گرا۔ وحی الٰہی نے اعلان کیا:-

تَبَّتْ يَدَا أَبِي لَهَبٍ وَّتَبَّ مَا أَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ۔

(ٹوٹ گئے دونوں ہاتھ ابولہب کے اور وہ خود بھی ٹوٹ گیا۔ اس کی دولت اور جو کچھ اس نے کمایا تھا، اس کے کام نہ آئی۔)

مکہ میں تیرہ سال کشمکش میں گذرے۔ اس کے بعد اہل مدینہ کی دعوت پر حضورؐ تشریف لے گئے اور ایک مثالی حکومت کی بنیاد رکھی۔ مدینہ کی مدافعت کے لئے اہل مدینہ کو، جہاں مسلم و غیر مسلم دونوں تھے، ایک قوم قرار دیا اور آپ نے نئے اسٹیٹ کے لئے اساسی طور پر چند دفعات مرتب فرمائے جس میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کی مشترکہ ذمہ داری کی نشاندہی تھی۔ باہمی حقوق کی طرف اشارے تھے اور اس حقیقت کا اعلان تھا کہ اختلاف کی صورت میں فیصلہ کا حق اللہ اور اللہ کے رسول کو ہوگا۔ اس طرح امارت اسلامی ایک مسلمہ حقیقت بن گئی۔

حضورؐ مدینہ میں دس برس رہے۔ اس کے بعد آپ نے داعیٔ اجل کو

لبیک کہا۔ حضورؐ کے بتائے ہوئے راستہ پر حضورؐ کے صحابہ کرامؓ چلے۔ کبھی ان میں اتفاق ہوا کبھی اختلاف۔ ان کے اتفاق نے اصول وضع کئے اور ان کے اختلاف نے ان اصولوں میں لچک پیدا کی اور اس طرح ہم بعد کے لوگوں کو قرن اولیٰ کی تاریخ نے اسلامی حکومت کا ایک تصور دیا۔ کسی صالح اور اچھی ریاست کو چلانے کے لئے کون سی بنیادی باتیں ہیں جن کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ اسلام کی سیاسی تعلیمات سے ان باتوں پر روشنی پڑتی ہے۔

بادشاہتوں کا مالک اصل میں اللہ ہے۔ اللہ جس کو چاہتا ہے، حکومت دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے چھین لیتا ہے جیسا کہ اس آیت قرآنی سے ظاہر ہے:

قُلِ اللّٰھُمَّ مٰلِکَ الْمُلْکِ تُؤْتِی الْمُلْکَ مَنْ تَشَآءُ وَ تَنْزِعُ الْمُلْکَ مِمَّنْ تَشَآءُ ط وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ بِیَدِکَ الْخَیْرُ اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝

کہہ دو، اے اللہ! تو بادشاہتوں کا مالک ہے جس کو چاہتا ہے، بادشاہی دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے بادشاہی چھین لیتا ہے جس کو چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے، ذلیل کرتا ہے، تیرے ہی ہاتھ میں بھلائی ہے، بے شک تو سب چیزوں پر قادر ہے۔

اول حکم ماننا اللہ کا ہے اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ اور اَلَا لَہُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ایک دوسری آیت میں ہے کہ:

اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ

اس میں اَطِیْعُوا اللّٰہَ مقدم ہے۔

اگر اللہ اور اس کے رسول کے حکم سے تصادم نہ ہو تو امیر و سلطان، والدین، بڑے بھائی اور استاذ کی اطاعت ہوگی اور اسی طرح ان سب لوگوں کی اطاعت بھی کی جا سکتی ہے جن کے ہاتھ پر اطاعت کا عہد کیا جائے۔

انسانوں کی وہ حکومت جسے معاشرہ اس غرض سے وجود میں لائے کہ حدود اللہ کی حفاظت کی جائے یعنی فرائض کی پابندی کی اور کرائی جائے، حلال کو حرام اور حرام کو حلال نہ ہونے دیا جائے، بھی باتوں کا حکم دیا جائے اور بری باتوں سے روکا جائے اور فتنہ فساد کو مٹایا جائے، اسلامی حکومت کہلاتی ہے۔ قانون سازی کا اختیار اور حق اس حکومت کو حاصل ہے بشرطیکہ یہ قانون سازی حدود اللہ کو توڑنے والی نہ ہو، معروف کو منکر اور منکر کو معروف نہ بنائے۔ اور شریعت اسلامی سے اس کا کہیں ٹکراؤ نہ ہو۔

اسلام میں امیر ریاست کے لئے امیر کا لفظ بھی مستعمل ہے اور سلطان اور خلیفہ کا بھی۔ خلیفہ زیادہ مستعمل رہا ہے۔ خلیفہ کے معنی نائب اور ڈپٹی کے ہیں۔ یہ لفظ بادشاہت اور غیر ذمہ دار حکومت کے تمام تصور کو مٹا دیتا ہے اور ایک جوابدہ اور ذمہ دار حکومت کا تصور پیدا کرتا ہے۔

امیر ریاست کے لئے اسلام کی سچائیوں پر ایمان لانا ضروری ہے اور اسلام پر عمل کرنا بھی۔ اس کے بعد صاحب تدبیر اور حسن اخلاق کا حامل ہونا بھی ضروری ہے مسلمانوں کے امیر اول خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے، جو منجانب اللہ مسلمانوں کے امیر و مطاع تھے۔ یہ آخری نبی تھے، ان کے بعد کوئی دوسرا نبی ہو گا اور نہ ہی منجانب اللہ (یعنی بذریعہ وحی)، کوئی مسلمانوں کا امیر و مطاع ہو گا۔ ان کے بعد مسلمانوں کے امیر حضرت ابوبکرؓ ہوئے جن کے ہاتھ پر ارباب حل وعقد نے بیعت کی اور جن کو صدیق کہا گیا۔ یعنی امور حق کی بلاجھجک تصدیق کرنے والا۔ اخلاق واعمال کے لحاظ سے نبیؐ کے بعد ان سے بہتر کوئی نہ تھا۔ حضرت صدیقؓ کے بعد حضرت عمر، حضرت عثمان اور حضرت علیؓ رضی اللہ عنہم مختلف طریقوں سے علی الترتیب امیر ہوتے گئے جن کو نطق نبوت نے شہید بتایا یعنی حق کے لئے جان دینے کو حاضر رہنے والے۔ یہ سب حضرات حسنِ اخلاق، حسن عبادت اور حسنِ تدبیر میں ممتاز تھے۔

حسنِ اخلاق کا حامل ہونا ضروری اس لئے ہے کہ اچھے لوگ خراب ملک

کو اچھا بنا سکتے ہیں اور برے لوگ اچھے ملک کو خراب بنا سکتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم پر حبشی غلام بھی امیر بنا دیا جائے تو اس کی اطاعت کرو۔ اس سے معلوم ہوا کہ خاندانی وجاہت، دولت وغیرہ کی خصوصیات کا امیر میں ہونا ضروری نہیں۔ ہاں، قرآن کریم میں حضرت طالوت کے قصہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ سلطان کو علم اور تندرستی کے اعتبار سے ممتاز ہونا چاہیئے۔

امیر کا انتخاب شوریٰ سے ہونا چاہیئے، خواہ اربابِ حل وعقد نے مشاورت کے بعد امیر کو منتخب کیا ہو خواہ امیر سابق نے بعد شوریٰ اسے نامزد کر دیا ہو اور امت اس پر جمع ہو گئی ہو، خواہ یہ صورت ہوئی ہو کہ کچھ لوگوں نے ایک شخص کو خلیفہ تسلیم کر لیا اور ایک زمانہ تک کوئی شخص اس کے سوا دعویدار خلافت ہی نہ ہوا ہو۔ چونکہ امت کے لئے غیر اجتماعی زندگی گذارنا اور بغیر امیر کے رہنا جائز نہیں ہے اس لئے اگر کسی دوسرے شخص نے ایک عرصہ تک خلافت کا دعویٰ کیا ہی نہیں تو اس کی خلافت قائم وثابت سمجھی جائے گی۔

خلافت کی بنیاد معاہدہ ہے جو مامور آمر کے ساتھ بذریعہ بیعت کرتا ہے۔ اربابِ حل وعقد کا بیعت کرنا کافی ہو سکتا ہے۔ اس معاہدہ کے ذریعہ خلافت کی بنیاد استوار ہوتی ہے۔

امیر ریاست کو عنانِ حکومت ہاتھ میں لینے سے پہلے اللہ ورسول کے احکام کے مطابق حکومت چلانے کا عہد کرنا پڑتا ہے۔ حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما نے یہ عہد کیا تھا۔ حضرت عثمان رضؓ سے اس عہد کے علاوہ حضرت ابوبکر رضؓ وعمر رضؓ کی اتباع کا بھی عہد لیا گیا تھا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اربابِ حل وعقد اللہ ورسول کی اتباع کے علاوہ کچھ دوسری ضروری مزید پابندیاں بھی حسب ضرورت امیر پر عائد کر سکتے ہیں۔ وفاداری کا یہ عہد محض رسمائی نہیں ہوتا بلکہ امیر ریاست کو اس کی پابندی کرنی پڑتی ہے اور امت کو اس پر کڑی نظر رکھنی چاہیئے۔

اگر خلیفہ، امیر یا سلطان منتخب یا نامزد ہو جائے تو امت میں اختلاف پیدا کرنا اور

مقابلہ میں دوسرے شخص کو امیر بنا کر کھڑا کرنا جائز نہیں۔

اسلام میں امیر یا خلیفہ قوم کا ملازم ہوتا ہے۔ سیدنا حضرت ابوبکر صدیقؓ کے اس بیان سے اس حقیقت پر روشنی پڑتی ہے:-

"میری قوم جانتی ہے کہ میرا کاروبار میرے اہل و عیال کے لئے کافی تھا۔ لیکن اب جب کہ میں مسلمانوں کے کام میں مشغول ہوں تو میرا خاندان حسبِ ضرورت ان کے مال سے کھائے گا اور ان کا کام کرے گا۔"

حکومت کو جلبِ منفعت کا ذریعہ بنانا درست نہیں ہے بلکہ یہ خدمت کا ذریعہ ہے۔ امیر ریاست کو بیت المال سے اسی وقت اور اتنا ہی ملے گا جس وقت اور جتنا اس کو ضرورت ہوگی۔ حضرت عثمانؓ کو ضرورت نہ تھی تو انہوں نے بیت المال سے کچھ نہیں لیا۔ سرکاری ملازمت کی حیثیت ایسی نہیں ہے جیسے کوئی روزگار کھل گیا ہو بلکہ وہ خدمت ہے (کہ اگر حالات اجازت دیں اور کسی طرح کی تنگی محسوس نہ ہو بلکہ فراخی اور خوشحالی ہو تو) بلامعاوضہ ہی انجام دینا چاہئے۔ مال کے حرص میں خدمت ٹھیک انجام نہیں پا سکتی۔ امیر کی حیثیت بیت المال کے ٹرسٹی اور نگراں کی ہے، مالک کی نہیں۔

امیر ریاست کے کیا حقوق ہیں اور وہ عوام کے سامنے کہاں تک ذمہ دار ہے، ان امور پر حضرت ابوبکر صدیقؓ کے اس خطبہ سے روشنی پڑتی ہے جو انہوں نے انتخاب خلافت کے بعد دیا تھا:-

"لوگو! میں تم پر حاکم مقرر کیا گیا ہوں حالانکہ میں تم سے بہتر نہیں ہوں۔ اگر میں اچھا کام کروں تو میری مدد کرو اور برائی کروں تو مجھے درست کرو۔ خدا نے چاہا تو کمزور شخص میرے نزدیک طاقتور ہوگا۔ یہاں تک کہ میں اس سے دوسروں کا حق دلا دوں۔ جب تک کہ میں خدا اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کروں تم میری اطاعت کرو لیکن

جب خدا اور اس کے رسول کی نافرمانی کروں تو تم پر میری اطاعت لازم نہیں ہے۔"

یہ محض حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی تقریر ہی نہ تھی، پورے زمانۂ خلافت راشدہ میں مسلمانوں نے اپنے حق کا استعمال کیا اور جب کبھی انہیں کوئی بات قابلِ اعتراض معلوم ہوئی، انہوں نے خلفاء سے باز پرس کی اور خلفاء نے اپنی صفائی پیش کی۔ حضرت علیؓ قاتلین عثمانؓ سے قصاص نہ لے سکے اور عاجز ہوئے تو عظیم گروہ صحابہؓ ان کے مقابلہ میں آگیا اور اس نے قانون ہاتھ میں لے لیا۔ قانون ہاتھ میں لینا گو صحیح نہ تھا لیکن اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حدود اللہ کی حفاظت کے لئے ہر فرد اپنے کو ذمہ دار سمجھتا تھا اور امیر ریاست اگر حدود اللہ کی حفاظت میں عاجز ہو تو لوگوں کو امیر کی اطاعت میں بھی تامل ہوتا تھا اور یہ کہ امیر کی اطاعت غیر مشروط نہ تھی لاطاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق۔

جزئیات میں امیر سے اختلاف نقض بیعت نہیں سمجھا جاتا۔ کتنے ہی مسائل ہیں حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے حضرت عمرؓ سے اختلاف کیا اور حضرت عبداللہ ابن مسعود نے حضرت عثمانؓ سے۔

جس طرح خلفائے راشدین جماعت کے سامنے اپنے کو جوابدہ سمجھتے تھے، اسی طرح اس علیم و خبیر اور سمیع و بصیر ہستی (اللہ) کے سامنے بھی اپنے کو جواب دہ سمجھتے تھے۔ جس سے دلوں کا چور اور نیتوں کا کھوٹ چھپ نہیں سکتا۔ اس خیال سے وہ لرزتے اور کانپتے رہتے تھے کہ ایک دن انہیں اللہ کے روبرو اپنے کئے کا حساب دینا ہے، گویا امیر ریاست مسلمانوں کے سامنے بھی بالواسطہ یا بلاواسطہ جوابدہ ہے اور خدا کے سامنے بھی۔

اسلام نے اس سے نہیں روکا ہے کہ کوئی مردِ صالح خلافت اور سلطنت کی خواہش کرے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے سلطنت مانگی۔ کہا: رَبِّ اغْفِرْلِی وَهَبْ لِی مُلْكًا لَّا يَنْۢبَغِي لِاَحَدٍ۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے مالیات کا

انتظام بادشاہتوں سے طلب کیا۔ حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہما نے خلافت کی خواہش کی۔ ہاں، یہ خواہش اس لئے ہونی چاہئے کہ نماز قائم کریں، زکوٰۃ کا نظم کریں اچھی باتوں کا حکم دیں اور بری باتوں سے منع کریں اور خلق خدا کی پسندیدہ طریقوں سے خدمت کریں۔

خلیفہ پر شوریٰ کا قیام واجب ہے۔ شوریٰ اسلام میں محض رسمی اور غیر موثر نہیں ہے۔ جن امور کا تعلق وحی سے نہ تھا، ان میں حضورؐ اپنی رائے پر صحابہؓ کی رائے کو ترجیح دیتے تھے۔ غزوۂ احد میں حضورؐ کی رائے مدینہ میں رہ کر جنگ کرنے کی تھی نوجوانوں کو اصرار تھا کہ آگے بڑھ کر دشمنوں کو روکا جائے۔ حضورؐ نے اپنی رائے واپس لی اور نوجوانوں کی رائے پر عمل کیا۔ نوجوانوں نے اپنی رائے واپس لی تو اس واپس لینے کو قبول نہیں کیا۔ غزوۂ خندق میں حضورؐ چاہتے تھے کہ دشمنوں کو مدینہ کی کچھ پیداوار دے کر صلح کر لیں۔ اہلِ مدینہ راضی نہیں ہوئے تو حضورؐ نے یہ ارادہ ترک کر دیا۔ ایک بار یمن کسی کو عامل بنا کر بھیج رہے تھے تو مشورہ فرمایا اور کہا کہ میری رائے تم لوگوں کی ایک رائے کے برابر ہے۔ جب نبیؐ کے وقت میں شوریٰ اتنی موثر تھی، حالانکہ جب وحی کے ذریعہ احکام آسکتے تھے، تو نبی کے بعد شوریٰ کا موثر ہونا اور اس کا فعال اور حقیقی ہونا اظہر من الشمس ہے۔

حضرت عمرؓ نے وقت شہادت ایک شوریٰ نامزد کی تاکہ وہ ان کے بعد ان کے جانشین کا انتخاب کر دے۔ فرمایا کہ اگر اس شوریٰ میں رائیں برابر ہوں تو وہ شخص امیر ہوگا جس کی حمایت حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کریں گے۔

مدینہ پہلی اسلامی ریاست کا پایۂ تخت تھا۔ نبیؐ و صدیقؓ کے علاوہ شہدا اور صالحین یہاں جمع ہو گئے تھے۔ اسلام کے فدائی مہاجرین و انصار سب یہاں تھے انہی سے حضورؐ اور پھر حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ مشورہ لیتے تھے۔ حضرت عثمانؓ کے عہد میں یہ گروہ منتشر ہو گیا اور مدینہ کے علاوہ مصر و شام و عراق وغیرہ میں بھی جا کر آباد ہو گیا۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ کو مشورہ کے لئے ان علاقوں سے عمال و امراء کو بلانا پڑا تھا۔

حضرت عمرؓ نے ایک چھوٹی سی کمیٹی شوریٰ کی بنائی۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ضرورت ہو تو منتخب لوگوں کی مجلس شوریٰ بنائی جا سکتی ہے اور بواسطہ امیر یا براہِ راست عام مسلمان اس شوریٰ کو اپنا حق مشورہ منتقل کر سکتے ہیں۔ عورت بھی مجلس شوریٰ میں شریک ہو سکتی ہے۔

سرکاری ملازمین کو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے جو یہ ہدایات بھیجی تھیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ سرکاری ملازمین کو کن کن باتوں کا پابند ہونا چاہیئے:۔

"خلوت و جلوت میں خدا سے ڈرتے رہو۔ جو خدا سے ڈرتا ہے، خدا اس کے گناہ معاف فرما دیتا ہے اور اس کے اجر میں اضافہ کر دیتا ہے بندگانِ خدا کی خیر خواہی کرو، اپنے دائرۂ حکومت میں جنبہ داری اور اقربا نوازی سے پرہیز کرو، حکومت کے اثر سے اپنے عزیزداروں کو دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ نفع پہنچانے کی کوشش نہ کرو۔ اس سے بہت احتراز کی ضرورت ہے۔ ماتحتوں کے دکھ درد میں شریک رہو۔ ایسا نہ ہو کہ وہ مصیبت میں مبتلا ہوں اور تم مزے کر رہے ہو۔"

جمہور مسلمان، خلیفہ کو، اگر نا اہل ثابت ہو، معزول کر سکتے ہیں۔ اگر خلیفہ کو معزول کرنے میں فساد کا احتمال ہو تو دیکھنا پڑے گا کہ فساد زیادہ کس صورت میں ممکن ہے، خلیفہ کو قائم رکھنے میں یا ہٹ جانے میں۔ جس میں فساد و نقصان کا اندیشہ کم ہو وہ صورت اختیار کی جائے گی۔

اسلام میں قتل کی سزا قتل ہے۔ زانی اور زانیہ کو، اگر شادی شدہ ہوں، سنگسار کرنا ہے۔ اگر غیر شادی شدہ ہوں تو درّے لگانا ہے۔ چور کا ہاتھ کاٹ لینا ہے۔ یہ ایسی سزائیں ہیں کہ اگر مقصود جرم کو مٹانا ہے تو ان کی صحت و اہمیت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ ہاں، اسلام نے ان سزاؤں کے جاری کرنے میں بڑے احتیاط کی ہدایت کی ہے اور ان پر بڑی پابندیاں لگائی ہیں۔ اگر الزام مشکوک ہو اور کوئی تاویل اس کی ہو سکے تو حد جاری کرنے سے منع کیا گیا ہے۔

اسلام میں انسان کی جان بڑی قیمتی ہے۔ اس کی حفاظت کے لئے ہدایات دی گئی ہیں۔ اور جو لوگ کسی بے گناہ کی جان لیتے ہیں ان کو عذابِ آخرت سے بھی ڈرایا گیا ہے اور دنیاوی سزا تو مقرر کی ہی ہے۔ اسلام میں ایک دِیَت کا قانون ہے، وہ یہ کہ اگر مقتول کے ورثاء جان کے بدلہ میں جان لینا نہ چاہیں تو قاتل ان کو اتنی رقم دے کہ وہ خوش ہو جائیں اور معاف کر دیں۔ اگر قاتل غریب ہے تو بیت المال سے بھی یہ رقم ادا کی جا سکتی ہے۔

ہر طرح کی فوجداری سزائیں حاکم عادل کے ذمہ ہیں۔ عام شہریوں کو قانون ہاتھ میں لینے کا اختیار نہیں ہے۔

اسلام میں قضا (عدالت) کی بڑی اہمیت ہے۔ مسلمانوں کو حکم ہے کہ اپنا فیصلہ اسلام کے دشمنوں سے نہ کرائیں۔ قاضی شریعت کو حکم ہے کہ وہ فیصلہ میں عدل کو ملحوظ رکھے۔ چھوٹے بڑے کا خیال نہ کرے۔ کسی مسلمان کی اس لئے حمایت نہ کر دے کہ وہ مسلمان ہے۔ کسی غیر مسلم کے خلاف اس لئے فیصلہ نہ کر دے کہ وہ غیر مسلم ہے۔ عدالت میں کسی فریق کے ساتھ ایسا رویہ اختیار نہ کرے کہ فریق ثانی کو یہ شبہ ہو کہ وہ اس کی عدالت سے انصاف نہیں پائے گا۔ بلکہ قوی و ضعیف دونوں کے ساتھ ثبوت لینے میں یکساں برتاؤ کرے اور ایک طرح سے پیش آئے۔ شہادت چھپانے کی سخت ممانعت ہے۔ حکم ہے کہ جو کچھ جانتے ہو صاف صاف بیان کر دو خواہ وہ تمہارے مفاد کے خلاف ہو۔ اسلام میں رشوت کی سخت ممانعت ہے۔

اسلام میں سفیروں کی بڑی اہمیت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ کو سفیر بنا کر مکہ بھیجنا چاہا۔ حضرت عمرؓ نے مشورہ دیا کہ حضرت عثمانؓ کو بھیجیں کہ ان کے لوگ مکہ میں برسرِ اقتدار ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ مشورہ قبول فرمایا۔ حضرت عثمانؓ گئے۔ مکہ والوں نے ان کو روک لیا۔ یہ خبر اڑی کہ وہ قتل کر دیئے گئے۔ سفیر کے قتل کو اسلام نے اتنی اہمیت دی کہ اس بنیاد پر اہل مکہ سے جنگ کی تیاری کی گئی اور سبھوں نے لڑنے کا عہد کیا۔ اور اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اس کو پسندیدہ فعل قرار دیا۔

بعد میں حضرت عثمانؓ تشریف لے آئے اور جنگ کی نوبت نہ آئی۔

اسلام میں معاہدات کی پابندی کا سخت حکم ہے۔ فریب کن معاہدہ کی اسلام میں اجازت نہیں۔ جو طے ہو جائے خواہ اپنے مفاد کے خلاف ہی کیوں نہ ہو، اس کو پورا کرنا ضروری ہے۔

حضرت ابو جندل صلح حدیبیہ کے بعد مکہ سے بھاگ کر حدیبیہ آئے۔ ان کو ان کے لوگ مسلمان ہونے کے جرم میں گرفتار کئے ہوئے تھے۔ حضرت ابو جندل کے والد نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مطالبہ کیا کہ شرائط صلح کی رو سے ان کو واپس کیا جائے۔ وہ رو پڑے اور عرض کیا یا رسول اللہؐ مجھے دشمنوں کے حوالہ نہ کیجئے۔ یہ اذیت دیتے ہیں، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ معاہدہ کی پابندی ضروری ہے پھر انہیں تسکین دی اور واپس کر دیا۔ اگر مسلمان دیکھیں کہ معاہدات کی پابندی نہیں ہو سکتی ہے تو اعلان عام کے ذریعہ معاہدات لوٹا سکتے ہیں۔

اسلام میں صلح کی بھی اہمیت ہے۔ صلح کو جنگ پر ترجیح دی گئی ہے۔ صلحِ حدیبیہ کفّار مکہ کی خواہش پر ہوئی۔ کفّار مکہ اپنی کمزوری محسوس کر رہے تھے۔ رسول اللہؐ چاہتے تو ان کو دبا سکتے تھے۔ لیکن اس کا الٹا ہوا۔ رسول اللہؐ نے ہی دب کر صلح کی، عام مسلمانوں کو ناگوار تھا لیکن قرآن کریم نے اس کو فتح مبین قرار دیا اور بعد کے واقعات نے ایسا ہی ثابت کیا۔

اسلام میں وطن کی بھی اہمیت ہے۔ حکم ہے جہاں رہو وہاں کی اصلاح اور درستگی کی کوشش کرتے رہو۔ گھر والوں، پڑوسیوں، بستی والوں، شہر والوں اور اہل ملک کے مفاد کا لحاظ نہ رکھنا، ان کی ترقی و اصلاح کی کوشش نہ کرنا معیوب ہے۔ وطن کی مدافعت و حفاظت ضروری ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس غرض سے غیر مذہب والوں سے معاہدات کئے ہیں۔ لیکن یہ مدافعت انصاف اور حق کے خلاف نہیں ہونی چاہیئے۔ جس طرح حق کے لئے ذاتی مفاد کو قربان کرنے کا حکم ہے، خاندان اور برادری کو قربان کرنے کا حکم ہے، اسی طرح وطن کے مفاد کو

قربان کرنے کا حکم ہے اسی طرح وطن کے مفاد کو بھی حق کے لئے قربان کرنا ہوگا اور حق تو یہ ہے کہ وطن کا مفاد حق کی حمایت ہی میں مضمر ہے۔

اسلام نے وطنی تنگ نظری کو پسند نہیں کیا ہے۔ تمام دنیا کے انسان آدمؑ کے بیٹے ہیں۔ سبھوں کی بھلائی مسلمانوں کے پیشِ نظر رہنی چاہئے اور کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہئے جس سے انسانیت کو صدمہ پہنچے۔ اور تنگ نظری پیدا ہو۔

یہی وجہ ہے اسلام عقیدۂ صحیحہ و اعمال صالحہ کی قربانی کر کے کوئی صلح پسند نہیں کرتا۔ وہ کفر و اسلام، شرک و توحید کو خلط ملط کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ سب سے پہلے عقیدۂ صحیحہ و اعمال صالحہ کی حفاظت ضروری ہے۔ اس کے لئے جان بھی دی جا سکتی ہے کیونکہ جان کی حفاظت کے بعد عزت و آبرو اور مال کی حفاظت کا معاملہ ہے مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ کسی غیر حق پر رضامند نہ ہو۔

عدم رضامندی کی تین شکلیں ہیں۔ پہلی شکل یہ ہے کہ طاقتور ہو تو ہاتھ سے روکے۔ طاقت نہ ہو تو زبان سے برا کہے اور اس کی بھی ہمت نہ ہو تو دل میں برا سمجھے لیکن یہ آخری صورت پسندیدہ نہیں ہے۔ اسے ایمان کا سب سے کمزور درجہ دیا گیا ہے۔ اگر کسی برائی کو دفع کرنے پر مسلمان قادر نہیں، زبان سے برا کہتا ہے اور دل سے بیزار ہے تو اس کو اللہ کے یہاں اس کا اجر ملے گا۔

برائیوں کو مٹانے کے لئے پر امن اور غیر جانبدارانہ طریقہ اختیار کرنے کا حکم ہے لیکن اگر کوئی گروہ اس پر رضامند نہیں کہ مسلمان حق کی اشاعت کریں اور اس کے لئے وہ جبر و ظلم پر اتر آئے اور کسی طرح کا اخلاقی اثر وہ گروہ قبول نہ کرے تو مسلمانوں کو اجازت ہے کہ امیر ریاست کے حکم پر تلوار اٹھا سکتے ہیں۔ اس لڑائی میں جو لوگ مارے جائیں گے ان کا درجہ بڑا ہوگا۔ مظلومین کی حمایت میں بھی جنگ کی جا سکتی ہے۔ معاہد قوموں کی حمایت میں بھی جنگ کی جا سکتی ہے بشرطیکہ یہ معاہد قومیں غیر حق پر نہ ہوں۔

جنگ و جہاد کے لئے اجتماعی زندگی ضروری ہے اور اجتماعی زندگی اولی الامر

کے بغیر وجود میں نہیں آتی ہے۔

اسلام کی روح مساوات ہے۔ اسلام کے دور اول میں سماجی مساوات کے نقوش نمایاں ہیں۔ حضورؐ نے فرمایا ہے کہ "عجمی کو عربی پر اور عربی کو عجمی پر، گورے کو کالے پر اور کالے کو گورے پر کوئی فضیلت نہیں، تم میں افضل وہ ہے جو اخلاق میں افضل ہے" حضورؐ نے فرمایا "تم سب آدمؑ کے بیٹے ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے۔" اور فرمایا کہ "لوگ شادی بیاہ میں حُسن یا نسب یا دولت کا لحاظ کرتے ہیں۔ اے مسلمانو! تم دینداری کا لحاظ کرو۔" چنانچہ مسلمانوں نے ایسا ہی کیا۔

سیاسی مساوات اس حد تک تو پائی جاتی ہے کہ حکومت موروثی نہ تھی اور اس حد تک کہ امیر ریاست خدا کے سامنے تو جواب دہ تھا ہی، ان عام مسلمانوں کے سامنے بھی جوابدہ تھا۔

معاشی مساوات میں دولت رکھنے اور حاصل کرنے کے حقوق سب کو برابر دیئے گئے۔ عورتوں کو بھی یہ حق حاصل تھا۔ زکوٰۃ و عشر کی وصولی بھی اس طرح نہ ہوئی کہ غریبوں پر زیادہ بوجھ پڑ جائے بلکہ وصولیٔ زکوٰۃ کا مقصد ہی یہ بتایا گیا کہ اغنیاء سے لیکر فقراء میں تقسیم کر دیا جائیگا۔ مال غنیمت کی تقسیم سب مجاہدوں میں برابر ہوتی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بھی مال غنیمت مسلمانوں میں مساوی تقسیم کئے۔ لوگوں نے مشورہ دیا السابقون الاولون کو زیادہ دیا جائے تو فرمایا کہ ان کا اجر اللہ کے یہاں ہے، معاش میں مساوات ہی بہتر ہے۔ لیکن حضرت عمرؓ نے اپنے عہد میں مدارج مقرر کئے۔ پہلے امہات المومنین، تب بنی ہاشم، تب اصحاب بدر وغیرہ۔ لیکن حالات کے دباؤ نے انہیں محسوس کرایا کہ حضرت ابوبکرؓ کا طریقہ بہتر تھا اور بولے کہ آئندہ سال زندہ رہا تو اول آخر کو برابر کر دوں گا لیکن اس سے پہلے ہی ان کا انتقال ہو گیا۔ حضرت عثمانؓ نے معمول کو نہیں بدلا۔ جب دولت میں بہت زیادہ عدم مساوات لوگ محسوس کرنے لگے تو حضرت ابوذر غفاریؓ نے اس کے خلاف احتجاج کیا اور غریبوں کو ابھارا کہ دولت مندوں سے اس کی دولت چھین لیں یہ شام میں تھے جہاں کے والی حضرت امیر معاویہؓ تھے۔ انہوں

نے حضرت عثمان رضؓ کو لکھا۔ حضرت عثمان رضؓ نے حضرت ابوذر غفاری رضؓ کو شام سے بلا لیا۔ ان کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا اور حضرت غفاری رضؓ خلیفۂ وقت کی رائے سے رضا کارانہ طور پر ایک خاص جگہ رہنے لگے۔

معلوم ہوتا ہے کہ دولت رکھنے، حاصل کرنے اور صرف کرنے کے جو حقوق اسلام نے افراد کو دیئے ہیں حضرت غفاری کے خیال میں ان حقوق کو محدود کر دینا جائز تھا اور یہ کہ جب دولت میں زیادہ عدم مساوات ہو جائے تو سماج کو مداخلت کا حق ہے۔

حضرت ابوبکر رضؓ نے جو یہ کہا تھا کہ دنیا میں معاشی مساوات ہی بہتر ہے۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت ابوذر غفاری رضؓ کی رائے حضرت ابوبکر رضؓ کی رائے سے قریب تھی بہر حال ان اختلافات کی روشنی میں کم از کم یہ نتیجہ تو نکالا ہی جائے گا کہ معاشی مساوات اور عدم مساوات اسلام کا ایسا بنیادی خیال نہیں کہ کسی ایک رخ کو قبول کرنا بہر حال ضروری ہو، یہ امیر ریاست اور ارباب حل وعقد کی صوابدید پر منحصر ہے کہ حالات کے پیش نظر جون سی راہ چاہیں اختیار کریں۔ اسلام ہر ملک ہر زمانے کے لئے ہے۔ اس میں معاشی مساوات اور عدم مساوات کے بارے میں ایک رخ اختیار کرنا صحیح بھی نہیں ہوتا۔

دولت اور ذرائع دولت پر افراد کا قبضہ ثابت ہے۔ اور باہم رضامندی سے ایک خاندان کا یا کچھ لوگوں کا مشترک قبضہ بھی ہوتا ہے اور اسلام اس سے منع نہیں کرتا اور جب کچھ لوگوں کا مشترک قبضہ ہو سکتا ہے اور اسے شرعاً قبول کیا جاتا ہے تو پورے ملک کے باشندوں کا بھی کسی معاہدہ کی بنا پر مشترک قبضہ ہو سکتا ہے اور اسے جائز سمجھا جائے گا۔

اگر حکومت خراب ہاتھوں میں آجائے تو اس کی اصلاح کی ذمہ داری افراد پر ہو گی۔ جو ملک میں بستے ہیں۔ اگر وہ وسائل دولت سے محروم ہوں تو حکومت کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھا سکتے۔ ضروری ہو گا کہ ان کے پاس حکومت کے خلاف شور و واویلا کرنے یا انقلاب کے لئے کوئی سرمایہ ہو۔ ایسی حالت میں حکومت کا تجوریوں پر قبضہ ہرگز صحیح نہیں،

مصلحت کے بالکل خلاف ہے۔ اگر عوام بگڑ جائیں اور حکومت کی باگ اچھے افراد اپنے ہاتھوں میں رکھتے ہوں اور عوام حکومت کے ساتھ تعاون کے لئے آمادہ و تیار نہ ہوں، خود غرضی اور بخل عام ہو، ایثار کا جذبہ ناپید ہو تو اس وقت وسائل دولت کا حکومت کے قبضہ میں ہونا صحیح ہوگا۔ لوگ کاہل اور سست ہوں تو یہ درست ہوگا کہ حکومت لوگوں سے جبری مزدوری کرائے۔

اسلام میں مزدوروں کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ رسول اللہؐ کا ارشاد ہے: مزدوروں کو مزدوری اس سے پہلے دے دو کہ ان کا پسینہ خشک ہو۔" اُس دور میں مزدور دو طرح کے تھے۔ ایک آزاد، جو کسی معاہدہ کی بنیاد پر مزدوری کر لیا کرتے تھے، اور دوسرے غلام، جو مالک کے حکم کے پابند تھے۔ اسلام میں جبری مزدوری پسندیدہ تو نہیں لیکن جائز ہے۔ اُس زمانہ میں جبری مزدوروں (غلاموں) کا عام رواج تھا۔ اسلام نے اس کو نہیں روکا لیکن ان کے حقوق وہی مقرر کئے جو حق آجر اپنے لئے رکھے ہوئے تھے۔ حکم ہوا کہ آجر جو خود کھائیں وہی غلاموں کو کھلائیں، جو خود پہنیں وہی ان کو پہنائیں، جو سہولت وہ اپنے لئے پسند کریں وہ ان کے لئے پسند کریں۔ سب وشتم اور مار پیٹ سے منع فرمایا۔ حضرت عمرؓ کو بیت المقدس کا سفر پیش آیا تو کچھ دور خود اونٹ پر ہوتے اور غلام پیدل چلتا اور پھر غلام کو اونٹ پر بٹھاتے اور خود پیدل چلتے۔ منزل سے قریب پہنچے تو غلام کی باری تھی کہ اونٹ پر بیٹھے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ اسی شان سے دشمنوں کے شہر میں داخل ہوئے کہ اونٹ کی مہار پکڑے تھے اور غلام اونٹ پر بیٹھا تھا۔

غلام کو زدو کوب کرنے اور سخت سست کہنے کا کفارہ یہ تھا کہ اس کو آزاد کر دیا جائے پھر اس سے جبری مزدوری نہیں لی جا سکتی تھی۔ جبری مزدوری پیداوار بڑھانے کے لئے بہت عمدہ ذریعہ ہے لیکن جب ایک طبقہ کے ذمہ یہ کام ہو اور آجروں کو استحصال بالجبر کے لئے چھوٹ دے دی جائے تو بڑے فساد پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس لئے اسلام نے اس کی ہمت افزائی کی کہ یہ غلام آزاد کئے جائیں اور مختلف مذہبی لغزشوں اور غفلتوں کا یہ کفارہ قرار دیا گیا۔

اسلام میں سودی کاروبار ممنوع ہے۔ جن لوگوں کے پاس معقول سرمایہ ہے اگر وہ اس سے بڑا کارخانہ کھولیں اور کچے سامان کی پیداوار پر، صنعت وحرفت پر اور مزدوروں کی مزدوری پر روپیہ صرف کریں تو ملک کی قوت پیداوار بڑھ سکتی ہیں۔ لیکن سودی کاروبار کا چسکا اس راہ میں حائل ہوتا ہے۔ بڑے سرمایہ دار آسان راہ اختیار کرتے ہیں، خود پیداوار بڑھانے میں روپیہ صرف نہیں کرتے بلکہ غریبوں کو قرض دیتے ہیں، پھر مع سود وصول کرتے ہیں۔ غریب اگر کاروبار یا کھیتی کے لئے روپیہ لے بھی تو چھوٹی رقم لے گا کہ کہیں کاروبار کو نقصان پہنچے، پیداوار نہ ہو تو مہاجن کو ادا کرنا ممکن نہ ہوگا اور مہاجن اس بات کی بھی کوشش کر سکتا ہے اور کرتا ہے کہ مقروض اپنے پاؤں پر کھڑا ہی نہ ہو کہ اس حالت میں سودی کاروبار مندا پڑ جائے گا۔ اس کی یہ کوشش رہتی ہے کہ مقروض اتنا بھر حاصل کرے کہ صرف سود بھرتا رہے۔ اس طرح کوئی بڑی تجارت ملک میں فروغ نہیں پا سکتی۔ بڑے سرمایہ دار کو چونکہ آسانی سے سودی کاروبار میں نفع مل جاتا ہے اس لئے وہ خود کاشتکاری میں یا اور کسی بڑے تجارتی کاروبار میں روپیہ لگانے کو ترجیح نہیں دے سکتے۔ اور بڑی تجارت اور صنعت وحرفت میں روپیہ لگاتے بھی ہیں تو اس طرح کہ پونجی ان کے قبضہ میں رہے۔ اس طرح غریب بہت غریب اور امیر بہت امیر ہوتے جاتے ہیں اور کچھ لوگوں کے پاس دولت محفوظ ہو جانے سے طرح طرح کی اخلاقی برائیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ مشاہدہ یہ ہے کہ غریبوں کو جتنا زیادہ مہاجنوں سے مستغنی کر دیا گیا اتنا ہی ملک کی تجارت نے فروغ پایا۔ خود یہ مہاجن اپنے سرمایہ کو تجارت پر لگانے پر مجبور ہوئے۔

دنیا کی حکومتوں نے مہاجنوں سے آزادی حاصل کرنے کی جو صورتیں نکالی ہیں ان میں چند درج ذیل ہیں۔

۱۔ شرح سود کم کر دیا جائے۔

۲۔ سود میں اس طرح اضافہ نہ ہونے دیا جائے کہ مقروض برباد ہو جائے جیسے کسی نے کوئی جائداد رہن رکھی اور مہاجن اس جائداد کی آمدنی سے کچھ عرصہ میں رقم وصول ہو جائے تو رہن ختم ہو جائے گا اور جائداد مقروض کو واپس مل جائیگی

اور مقروض نہ سمجھا جائے گا۔

۳۔ خود حکومت حاجتمندوں کو قرض دے۔

۴۔ حکومت بے کاری اور غربت دفع کرنے کے لئے مختلف تدبیریں اختیار کرے۔

۵۔ ایک تدبیر یہ ہے کہ وسائل دولت پر حکومت کا قبضہ ہو اور باشندگان ملک سب کے سب مزدور ہوں اور حکومت مزدوروں کے مشورے سے چلائی جائے۔

اسلام نے سودی کاروبار کو یک قلم منسوخ کردیا، قمار بازاری کو روک دیا، بیکاری کو ناجائز قرار دیا، ہر شخص کے لئے حاجت کے مطابق محنت مزدوری کرنا ضروری قرار دیا۔ معیارِ زندگی میں وسط کی راہ اختیار کرنے کی ہدایت کی، جمع سرمایہ میں رکاوٹیں پیدا کیں۔ سب سے بڑی رکاوٹ زکوٰۃ ہے۔ اگر سرمایہ دار سرمایہ کو تجارت میں نہیں لگاتا ہے تو اس کا جمع سرمایہ آہستہ آہستہ ٹیکسوں (زکوٰۃ) کی نذر ہوجائیگا۔ معاشرتی کفالت حکومت کے ذمہ ہے۔ افراد کو بھی ہدایت ہے کہ وہ بلاسودی قرضے غریبوں کو دیں۔

تجارت میں مزدوری کا ایک طریقہ نفع میں شرکت ہے جس کو مضاربت کہتے ہیں۔

معاشرتی کفالت صرف مسلمانوں کے لئے نہیں بلکہ غیر مسلم اہل ذمہ کے لئے بھی ہے۔ ذمیوں (غیر مسلم باشندگان ریاست اسلامی) کے لئے تمام وہ حقوق ہیں جو مسلمانوں کے لئے ہیں۔ ان کو اپنے مذہب پر عمل کرنے کی آزادی ہے۔ ان کی جان اور ان کے مال کی حفاظت کے مسلمان ذمہ دار ہیں۔ مسلمانوں کے جان و مال کی حفاظت کی ذمہ داری ذمیوں پر نہیں ہے کیونکہ وہ اس اصول و عقیدہ کو قبول نہیں کرتے جس اصول و عقیدہ پر حکومت قائم کی گئی ہے۔

اسلام نے گرچہ انفرادی حق ملکیت کو نہیں روکا پھر بھی خوراک کی ذمہ داری حکومت پر ہے۔ قحط کے دنوں میں مملکت کے دوسرے حصوں سے غلے قحط زدہ علاقوں میں پہنچانا اور مفت تقسیم کرنے کی مثالیں حضرت عمر فاروق رضؓ اور حضرت امیر معاویہ رضؓ کے دور میں ملتی

ہیں۔ بغیر قحط کے بھی، خزانہ سرکاری میں غلوں کا ذخیرہ کرنا، کہ وقت ضرورت کام آئے قرآن میں حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ میں بتایا گیا ہے۔

چونکہ اسلام نے بلاسودی قرض دینے کی ہمت افزائی کی ہے اس لئے قرضوں کی رقوم کے تحفظ کی ذمہ داری بھی اسلامی حکومت پر عائد ہوتی ہے اور قرض دینے والا عدم ادائیگی کی صورت میں سرکاری عدالت میں چارہ جوئی کر سکتا ہے اور ثبوت مہیا ہونے پر قاضی شریعت قرض کی رقم قرض دار سے بالجبر دلائے گا۔

سرکاری خزانہ کو بیت المال کہتے ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں حضرت ابوعبیدہؓ اس کے انچارج تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو "امین الامت" کہا تھا۔

بیت المال میں مال غنیمت کا خمس، سونے چاندی کے زکوٰۃ، تجارت کے مال کی زکوٰۃ، جمع رقوم کی زکوٰۃ، فطرہ، وہ اموال جن کا کوئی وارث نہ ہو، وغیرہ رکھے جاتے ہیں۔ مسلمانوں پر ضروری ہے کہ وہ امیر کو زکوٰۃ ادا کریں۔ جو لوگ امیر کو زکوٰۃ نہ دیتے تھے ان سے ابوبکر صدیقؓ نے جہاد کیا۔

مصارف میں جہاد کا خرچ، مسکینوں، غریبوں کا خرچ، مسافروں کا خرچ، عمال حکومت کا خرچ، قیدیوں کو چھڑانے کا خرچ وغیرہ داخل ہیں۔

سیاسی و معاشی عدل قائم رکھنا ہے تو ایک خدا پر یقین اور یہ یقین کہ ایک دن ہم کو اپنے کئے کا حساب اللہ کو دینا ہوگا اور یہ یقین کہ قرآن جو اچھی باتوں کا حکم دیتا ہے اور بری باتوں کے نتائج سے ڈراتا ہے، اللہ کا کلام ہے جو اس نے اپنے بندے محمد (صلعم) پر اپنے فرشتہ جبریل کے واسطہ سے بھیجا، بہت مفید اور ضروری ہے۔ اہل سیاست و معیشت کے دل میں یہ باتیں پیوست ہو جائیں تو وہ برائی اور ناانصافی سے ڈریں گے اور احکام اسلامی کا احترام کریں گے۔ اور اس لئے کسی وقت اس کی نافرمانی کا جذبہ دلوں میں پیدا نہیں ہوگا۔ اپنے جیسے انسانوں کا بنایا ہوا قانون دلوں میں وہ احترام پیدا نہیں کرتا اور اس میں ادل بدل کی خواہش ہر شخص کبھی نہ کبھی کرتا ہے۔ لیکن قادر حقیقی کے بتائے ہوئے اصولوں میں تبدیلی کی ضرورت اس وقت تک محسوس نہیں ہو سکتی جب

تک کہ جذبۂ عبودیت موجود ہے اور اسے عبادات کے ذریعہ مضبوط و مستحکم کیا جاتا ہے۔ نوعِ از ۱۰،نے تجربوں اور مشاہدوں کے ذریعہ سچائی کا جو روپ پایا ہے، قرآن اسی سچائی لی دعوت دیتا ہے۔ اللہ ان کو اجازت ہے کہ جو قانون بھی بنائے، اس سچائی کے دائرہ میں بنائے۔

اسلام اور جنگ

قرآن کریم میں سورہ توبہ کی آیت ہے:

وان جنحوا للسلم فاجنح لہا وتوکل علی اللہ۔

(اگر دشمن امن چاہتے ہوں تو تم بھی امن چاہو اور اللہ پر بھروسہ رکھو)۔

یعنی مسلمان تو جنگ چاہتا ہی نہیں، وہ تو امن کا خواہش مند ہے، اس کے رسول نے کہا کہ تم مسلمان نہیں ہو سکتے جب تک تم سرتاسر محبت والفت نہ بن جاؤ۔ اس کو حکم ہے کہ لوگوں سے کہو "سلام" یعنی امن۔ جنگ وجدال میں تو دشمن ہم کو کھینچ لاتے ہیں پھر بھی اگر دشمن یہ کہہ دیں کہ وہ جنگ نہیں چاہتے تو اے مسلمانو تم بھی جنگ نہ چاہو، امن کے خواہش مند ہو جاؤ اور اللہ پر بھروسہ کرلو کہ دشمن امن کی پیشکش پر قائم رہے گا۔

دوسری جگہ قرآن میں ارشاد ہے:

وقاتلوا ھم حتی لاتکون فتنہ ویکون الدین کلہ للہ

فان انتھوا فان اللہ بما یعملون بصیر۔

ترجمہ: ان کے ساتھ قتال کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین صرف اللہ کا رہ جائے لیکن اگر دشمن لڑائی سے باز آجائیں تو تم بھی باز آجاؤ بیشک جو کچھ وہ کرتے ہیں اللہ ان کو دیکھ رہا ہے۔

یہاں بھی یہی حکم ہے کہ دشمن لڑائی کا ارادہ نہ کریں تو تم بھی لڑائی کا ارادہ نہ کرو لیکن اگر وہ لڑیں تو تم بھی ان سے لڑو یہاں تک کہ جس دین کو مٹانے کے لئے انہوں نے جنگ شروع کی ہے وہی دین رہ جائے۔

بخاری کی حدیث ہے:

"جب دشمن کا سامنا کرنے کا ارادہ کرو تو امام سورج نکلنے کا ارادہ کرے پھر کھڑا ہو اور کہے" اے لوگو! دشمنوں کے مقابلہ کی تمنا مت کرو، اللہ تعالیٰ سے عافیت مانگو اور آرام طلب کرو لیکن جب دشمن کا سامنا ہو جائے تو ثابت قدم رہو اور جان لو کہ جنت تلواروں کے سایہ میں ہے۔"

یہاں لڑائی سے پہلے کی آخری حالت کا بیان ہے۔ حکم ہے کہ جب دشمن سے مقابلہ ناگزیر ہو جائے اور کسی طرح اس کو نظرانداز نہ کیا جاسکے تو اس آخری لمحہ میں بھی لوگوں کو یہ بتا دیا جائے کہ ہم کیا چاہتے ہیں یعنی اسلام کیا چاہتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ لڑائی کی تمنا مت کرو۔ جنگ چاہنا امن پسندوں کا شیوہ نہیں جو رات دن اپنے بھائیوں کو "السلام علیکم" کہتے ہیں یعنی تم پر امن و سلامتی ہو، ان کے شایان شان یہ نہیں ہے کہ جنگ کی خواہش کریں۔ ان کو اللہ تعالیٰ سے امن و عافیت ہی طلب کرنا چاہئے لیکن جب دشمنوں کا سامنا ہو ہی جائے تو گھبرانا اور بھاگنا نہیں چاہئے، بلکہ ثابت قدمی اور ہمت کا ثبوت دینا چاہئے، پھر تو موت سے محبت کرنی ہے، تلواروں کے قبضوں پر ہمارے ہاتھ ہوں اور ہم دشمنوں کو للکار رہے ہوں کہ تمہیں جنگ کی خواہش ہے تو موت کی تمنا کر لو۔ تم کو پیٹھ نہ دکھانے والی ایک قوم کا مقابلہ کرنا ہے۔

بہر حال مسلمانوں کو تعلیم یہی ہے کہ اگر دشمن چھیڑ چھاڑ نہ کریں اور امن چاہیں تو مسلمانوں کو لڑنا نہیں ہے، وہ امن اور چین سے رہیں لیکن اگر دشمن جنگ چھیڑے تو اس وقت تک جنگ جاری رہنی چاہئے جب تک "فتنہ" باقی رہے۔ یہاں تک کہ "دین امن و سلامتی" ہی باقی رہ جائے۔

اس وقت تک لڑنا جب تک "فتنہ" باقی رہے کا مطلب یہی ہے کہ ایک معرکہ پر ہی جنگ ختم نہیں ہوگی بلکہ سلسلۂ جنگ جاری رہے گا یہاں تک کہ دشمن تھک جائیں اور یہ سمجھ لیں کہ جنگ و جدل اور فتنہ و فساد مسئلہ کا حل نہیں ہے بلکہ امن و سلامتی مسئلہ کا حل ہے۔ اگر دشمنوں میں کچھ لوگ ایسے پیدا ہو جائیں جو جنگ نہیں تو ان کو اپنے عمل

سے اس کا ثبوت دینا ہوگا۔ ثبوت یہ کہ وہ ایسے فسادیوں کے مقابلہ میں آجائیں اور مسلمانوں کا ساتھ دیں یا کم از کم ان فسادیوں میں رہ کر ان کی شدت سے مخالفت کریں یہاں تک کہ مفسد فساد نہ کرنے پر مجبور ہو جائیں اگر وہ مسلمانوں کا ساتھ نہیں دیتے یا مفسدوں کو بزور نہیں دباتے تو ایسے لوگوں کا بیٹھے رہنا قابل اعتبار نہیں ہے۔

دشمن لڑائی سے باز آجائیں، کا مطلب یہ ہے کہ دشمنوں کے لیڈر مصالحت کی پیش کریں۔ لڑائی کے وقت بھاگنا مسلمانوں کے لئے حرام ہے۔ قرآن میں ہے:

یاایھا الذین اٰمنوا اذا لقیتم الذین کفروا زحفا فلا تولوھم الادبار۔ (انفال)

ترجمہ: "اے ایمان والو! جب کافروں کا سامنا ہو جائے تو کبھی پیٹھ نہ دکھاؤ۔"

دوسری جگہ ارشاد ہے:

ومن یولھم یومئذ دبرہٗ الا متحرفا لقتال او متحیزا الیٰ فئۃٍ فقد باء بغضب من اللہ فماواہ جھنم وبئس المصیر

ترجمہ: جس کسی نے اس روز اپنی پیٹھ دکھائی وہ بیشک اللہ کے غضب میں پڑا اس کا ٹھکانہ جہنم ہوگا اور وہ برا ٹھکانہ ہے ہاں دشمن کو دھوکہ میں ڈالنے کے لئے یا اپنی فوج سے ملنے کے لئے بھاگیں ان پر کوئی گناہ نہیں ہے۔

اس نیت سے بھاگنا کہ ہم اپنی فوج سے جو دوسری جگہ ہے مل جائے اور پھر زیادہ طاقتور ہو کر دشمنوں پر حملہ کریں یا کہیں مسلمانوں کی بڑی جماعت ہے اس سے مل جائیں اور پھر مل کر دشمنوں پر حملہ کریں یا بھاگتا ہوا دکھا کر دشمنوں میں یہ گمان پیدا کردیں کہ مسلمانوں میں لڑنے کی طاقت نہیں اور ان کو غافل پاکر ان پر حملہ کریں تو یہ جائز ہے، ورنہ خوف سے بھاگنا اور اس نیت سے بھاگنا کہ نہیں لڑیں گے جبکہ لڑائی سر پر آگئی ہو، ناجائز ہے۔ رسول اللہ صلعم نے اس سے پناہ مانگی ہے کہ میدان جنگ میں بھاگتے

ہوئے جان دیں۔ ارشاد ہے اللھم انی اعوذبك من ان اموت مدبرا

ترجمہ: اے اللہ! میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس بات سے کہ میدان جنگ میں

پیٹھ دکھاتا ہوا مارا جاؤں۔

ماضی قریب میں ایسی بہت لڑائیاں ہوئیں جن میں مسلمان نہیں لڑے بھاگے یا اپنے کو دشمنوں کے حوالہ کر دیا اور اس کا انجام بہت خراب ہوا۔ وہ سب کے سب مارے گئے۔ ان کی عورتوں اور بچوں کو زندہ جلایا گیا۔ ان کے مکانات کو منہدم کر دیا گیا، ان کے مال واسباب کو لوٹ لیا گیا۔ اسی کو اللہ کا غضب کہتے ہیں۔ لڑنا پڑے تو بہادروں کی طرح لڑو تاکہ دشمن سمجھیں کہ ان کے آدمی بھی مارے جا سکتے ہیں، ان کی چیزیں بھی نقصان ہو سکتی ہیں اس لئے حملہ کرنے سے پہلے وہ خوب اچھی طرح سوچ لیں گے کہ جو لڑتے نہیں ان کو لڑائی کی دعوت دینے کا کیا فائدہ۔

"یاد رکھئے چھوٹی جماعت بڑی جماعت پر اللہ کی مدد سے غالب آجاتی ہے اس لئے اللہ تعالیٰ کی مدد طلب کرنی چاہئے۔" یہ حدیث ہے۔

اللھم اھزمھم وزلزلھم

ترجمہ: "اے اللہ! ان کو شکست دے اور ان کے پائے ثبات میں لغزش پیدا کر دے" یہ دعا بھی حدیث میں آئی ہے

دوسری دعا ہے

اللھم انا نجعلك فی نحورھم ونعوذبك من شرورھم

"اے اللہ! میں تجھ کو ان کا مقابل بتاتا ہوں اور ان کے شر سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔"

اگر دشمن گھیر لیں تو دعا کرے:

اللّٰھمّ استر عوراتنا وامن روعاتنا

"اے اللہ ہماری کمزوریوں پر پردہ ڈال دے اور ہمیں مشکلات سے پناہ دے۔"

جو اللہ کے راستہ میں مارے جاتے ہیں انہیں اللہ تعالیٰ حیاتِ ابدی بخشتا ہے۔ وہ منع کرتا ہے کہ انہیں مردہ کہا جائے۔ جن کے نقوش قدم لوگوں کو ہمیشہ بہادری پر ابھاریں گے وہ تو زندوں ہی کا کام کرتے رہیں گے۔ وہ مردہ کہاں ہیں۔ قرآن میں ارشاد ہے:

ولا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ اموات بل احیاء ولاکن لا تشعرون

"اور جو اللہ کے راستہ میں مارے جائیں ان کو مردہ مت کہو وہ زندہ ہیں لیکن تم نہیں سمجھتے۔"

ایک اور جگہ قرآن میں جہاد و قتال کی تاکید فرمائی ہے اور جہاد کے لئے حیات کا لفظ استعمال کیا ہے۔

یا ایھا الذین امنوا استجیبوا للہ و رسولہ اذا دعاکم لما یحییکم

اے ایمان والو جب اللہ اور اس کا رسول تم کو اس چیز کی طرف بلائیں جو تمہیں زندگی بخشنے والی ہو تو تم اس دعوت کو قبول کرو۔

یہ لڑائی زندگی بخشنے والی اسی وقت ہے جب دشمن ہمیں لڑنے پر مجبور کر دیں۔ اور بجز لڑائی فتنہ دور کرنے کی کوئی اور صورت باقی نہ رہے۔

ایک جگہ اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا

واتقوا فتنۃ لا تصیبن الذین ظلموا منکم خاصۃ اعلموا ان اللہ شدید العقاب

ترجمہ: "ڈرو فتنہ سے جس کے شکار صرف ظالم نہ ہوں گے اور جان لو کہ اللہ سخت بدلہ لینے والا ہے۔"

مطلب یہ ہے کہ جو تمہارے سروں پر لڑائی مسلط کر رہے ہیں اگر ان کا مقابلہ نہیں کیا تو اللہ تعالیٰ کی گرفت میں صرف ظالم ہی نہ آئیں گے وہ عارضی کامیابی پر اترالیں۔ ان کی سزا تو اللہ تعالیٰ ایک نہ ایک دن کر کے رہے گا۔ لیکن تم اپنی غفلت اور بزدلی اور جنگ سے گریز کی وجہ سے مارے جاؤ گے اور تباہ کر دیئے جاؤ گے۔ اس لئے اس

فتنہ سے ڈرو اور جہاد کی دعوت کو قبول کرو۔

اور دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

ان کان اباؤکم وابناءکم واخوانکم وازواجکم واموال اقترفتموھا وتجارۃ تخشون کسادھا ومساکن ترضونھا احب الیکم من اللہ ورسولہ وجہاد فی سبیلہ فتربصوا حتی یاتی اللہ بامرہ واللہ لایھدی القوم الفاسقین۔

ترجمہ: "اگر تمہارے باپ دادا، تمہارے بیٹے، تمہارے بھائی، تمہاری بیویاں اور تمہارے مال جو تم نے حاصل کئے ہیں تمہاری تجارت جس کے مندا پڑ جانے کا تم کو خطرہ ہے اور تمہارے گھر جو تمہیں پسند ہیں، اللہ اور رسول اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ پسند ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ کا حکم یعنی عذاب تم پر آجائے۔"

امن کے زمانہ میں بھی اللہ تعالیٰ مستعد اور ہوشیار رہنے کو کہتے ہیں۔ حکم ہے:

واعدوا لھم ما استطعتم من قوت ومن رباط الخیل ترھبون بہ عدو اللہ وعدوکم واخرین من دونھم لا یعلمونھم اللہ یعلمھم۔

ترجمہ: دشمنوں کے مقابلہ میں اپنی پوری قوت سے تیار رہو اور تمام اسلحوں کے ساتھ تاکہ اللہ کے دشمن اور تمہارے دشمن اور ان کے سوا دوسرے لوگ جن کو تم نہیں جانتے بلکہ اللہ ہی جانتا ہے، تم کو ایذا پہنچانے سے ڈریں اور خائف رہیں۔

اور حکم ہے:

اطیعوا اللہ ورسولہ ولا تنازعوا فتفشلوا وتذھب ریحکم ان اللہ مع الصابرین۔

ترجمہ: اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو، آپس میں جھگڑے نہ کرو ورنہ

تمہارے دل چھوٹ جائیں گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔"

یہ آخری آیت ان لوگوں کے لئے قابلِ غور ہے جو واحد نمائندگی کا دعویٰ کر کے دوسری مسلم جماعتوں کے ساتھ مل بیٹھ کر باہم مشورہ کرنے سے گریز کرتے ہیں اور مسلمانوں کے محاذ کو کمزور کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس سے تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ کشیدہ رہنے اور ایک دوسرے پر الزامات کی فہرست تیار کرنے سے کمزوری آئے گی۔ تم ثابت قدم نہیں رہ سکو گے حالانکہ اللہ کی مدد ثابت قدم رہنے والوں ہی کو ملے گی۔ حکومت کی سرپرستی پر اترانے والوں کو نہیں ملے گی۔

مظلوموں کو چاہیئے کہ اپنے باہمی جھگڑے ختم کریں، اللہ و رسول کی طرف رجوع کریں اتحاد و اتفاق سے ان کا رعب و دبدبہ قائم ہوگا اور وہ صبر و ثبات سے مخالف ہواؤں کا مقابلہ کر سکیں گے۔ یہ پیغام دنیا بھر کے مسلمانوں کے لئے ہے خاص طور سے ان مسلمانوں کے لئے جو دوسروں کے ظلم و جبرہ دستی کا شکار ہوں۔ جو لوگ یہ الزام دیتے ہیں کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا انہیں چاہیئے کہ اسلام کے اصول جنگ کو سمجھ لیں۔ تلوار صرف اسی وقت اٹھانے کی اجازت ہے جب صلح کے تمام راستے مسدود ہو جائیں اور جنگ کرنے پر مظلوموں کو مجبور کر دیا جائے اور جب جنگ کی نوبت آ ہی جائے تو جنگ کے تمام راستوں کو بند کر کے ہی تلواریں میان میں رکھی جائیں گی۔

انسان کا مقام بلند

انسان کو اللہ تعالیٰ نے خلیفۃ فی الارض بنایا ہے۔ اس کو بتایا ہے کہ زمین و آسمان میں جو کچھ ہے، اس کے قابو اور اختیار میں ہے۔

(۱)۔ سخر لکم ما فی السمٰوٰت والارض

(زمین اور آسمان میں میں جو کچھ ہے سب تمہارے قابو اور اختیار میں ہے۔)

(۲)۔ سخر لکم الفلک لتجری فی البحر بامرہ وسخر لکم الانہار وسخر لکم الشمس والقمر وسخر لکم اللیل والنہار۔

(اللہ نے تمہارے لئے کشتی کو مسخر کر دیا تاکہ اس کے حکم سے سمندر میں چلے اور اس نے تمہارے لئے دریاؤں کو مسخر کر دیا اور اس نے تمہارے لئے سورج اور چاند کو مسخر کر دیا جو برابر چلتے ہیں۔ اس نے تمہارے لئے رات اور دن کو مسخر کر دیا۔)

لیکن اس عالی مرتبت انسان کو زمانہ نے کتنا رسوا کیا ذلیل کیا ــــ؟ یہ انسان خود انسان کے آگے جھکا، پیڑوں اور پتھروں کے آگے جھکا اور ان کے آگے نقد جاں پیش کرنے میں بھی اسے پس و پیش نہیں ہوا۔ اس کو ستاروں، سمندروں اور دریاؤں سے ڈرایا گیا اور ان کی پرستش پر آمادہ بلکہ مجبور کیا گیا۔ اچھے اچھے دانا، حکیم اور عقل مندوں اور دانشوروں نے بھی بتایا تو یہ بتایا کہ ستاروں کی گردش کو انسانوں کی قسمت میں دخل ہے۔ انسان ان تمام مقامات ذلت سے گذرا، کبھی اس نے ان حالات پر قناعت کی، کبھی اس کی فطرت نے اس کو اس پر آمادہ کیا کہ وہ ان بندشوں کو توڑ دے۔ اس نے سمندروں کو چیرا، پہاڑوں

کو عبور کیا، فضاؤں میں پرواز کی، غلط عقیدوں اور فرسودہ مذموم رسموں نے اس کا ہاتھ پکڑا تو اس نے جھٹک دیا۔ جو رخصت و سہولت پر عمل کرتے تھے انہوں نے اپنے ہاتھ باندھ لئے۔ پاؤں میں زنجیریں ڈال لیں اور جو عزیمت پر عمل کرتے تھے اور بلند حوصلے تھے، انہوں نے چاند پر کمندیں پھینکیں اور خلاء میں اسٹیشن قائم کر رہے ہیں۔ آج کے توہم پرست انسانوں پر جواہر لال نے یہ طنز کیا ہے کہ پہلے لوگ چندرما سے ڈرتے تھے اب اس کا پیچھا کیا جا رہا ہے۔ امید رکھئے کہ چندرما کی جان بچ جائے گی۔"

لیکن آسمانی کتاب قرآن کریم نے چودہ سو برس پہلے کہہ دیا تھا کہ "چاند اور سورج تم انسانوں کے لئے مسخر کر دیئے گئے ہیں یعنی تمہارے قابو اور اختیار میں دے دیئے گئے ہیں۔"

دنیا کی تاریخ میں پہلی بار اتنی قوت کے ساتھ یہ اعلان کیا گیا تھا کہ کائنات کو تمہارے لئے مسخر کر دیا گیا تھا۔ اس اعلان سے تو ایک طرف شرک کی جڑیں کٹ گئیں۔ اجرام فلکی اور دیگر مخلوقات ارضی سے انسان کے مقام کا ارفع و اعلیٰ ہونا ثابت ہوا۔ دوسری طرف اس اعلان سے وہ دور شروع ہوا جس کا نام دور سائنس ہے یعنی پہلی بار انسان کو شدت کے ساتھ اس بات کا احساس ہوا کہ اس کائنات میں کوئی چیز بھی معبود OBJECT OF WORSHIP نہیں بلکہ ہر چیز جستجو اور تحقیق کا موضوع OBJECT OF INVESTIGATION ہے۔ جب اس ذہن نے کام کرنا شروع کر دیا تو ایجادات اور انکشافات کا دور شروع ہوا۔ پہلے دمشق، بغداد، قرطبہ، غرناطہ نئی ایجادات کے مرکز تھے لیکن جب مسلمانوں پر زوال آیا تو علوم اور ایجادات کا مرکز بدل گیا۔ یورپ نے یہ علوم مسلمانوں سے سیکھے اور اس کے بعد وہ ان علوم میں دنیا کا امام اور پیشوا بن گیا۔

جب تک انسان کو یہ علم نہیں حاصل ہوا کہ چاند پر اسے جو اختیار ہے اسے وہ استعمال کس طرح کرے اور کیسے وہاں پر پہنچے اس وقت تک وہ کچھ نہ کر سکا اور جب اس کا علم ہو گیا تو وہ چاند پر اتر رہا ہے۔ صرف اختیار کا حاصل ہونا کافی نہیں ہے بلکہ اختیار کو استعمال کرنے کا علم بھی ضروری ہے۔

نجات کی راہ

آج کل مسلمانوں کا من حیث الجماعۃ کوئی مقصد نہیں ہے۔ ٹولیاں ہیں اور ہر ٹولی اپنا الگ مقصد رکھتی ہے۔ کوئی جماعت سیکولرزم کا نعرہ لگا رہی ہے کوئی کمیونزم کوئی سوشلزم کا اور کوئی نوکریوں میں نشستیں چاہتی ہے کوئی قانون ساز مجالس میں۔ جو لوگ جماعتوں سے الگ ہیں وہ ذاتی منفعت اور خاندان کی خدمت اور بال بچوں کی پرورش سے آگے نہیں سوچتے مسلمانوں کو چاہئے کہ من حیث الجماعۃ اپنا قومی مقصد متعین کریں۔ جس ملت کا کوئی مقصد نہ ہو وہ ملت ملی حیثیت سے ترقی نہیں کرتی۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا تھا تاکہ دین حق یعنی اسلام کو تمام ادیان پر ظاہر و غالب کر دیا جائے، اگر کافروں کو اور مشرکوں کو ناگوار ہو تب بھی۔ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پیچھے ایک امت چھوڑی اور یہ بتایا کہ اب کوئی نبی نہیں آئے گا۔ دین حق کی اشاعت اور اس کو غالب و ظاہر کرنا اس امت کے ذمہ ہے۔

یہی وہ نصب العین ہے جس کے لئے ہر مسلمان کو جد و جہد کرنی چاہئے۔ اس کے لئے کسی طرح کی قربانی سے دریغ نہیں کرنا چاہئے۔ اس مقصد کو جان سے زیادہ عزیز سمجھنا چاہئے۔

مقصد کے بعد دوسری چیز نظم جماعت ہے۔ تنظیم کے بہت طریقے اور قاعدے ہیں۔ اللہ اور اللہ کے رسول نے جو قاعدہ ہمیں بتایا ہے وہ یہ کہ مسلمانوں کا ایک امیر ہو جو شوریٰ کا پابند ہو اور مسلمان مذہبی امور میں اس کی اطاعت کریں۔ امیر کے منتخب یا نامزد ہونے کے بعد تمام مسلمانوں خواہ عالم ہوں یا جاہل، مامور ہوں گے۔

نظم جماعت کے بعد تیسری چیز مسلمانوں کا باہم اتحاد اور ارتباط ہے اور یہ چیز حاصل ہوگی اختلافِ خیال کو برداشت کر لینے سے، ایک دوسرے کی خدمت کرنے سے اور دشنام طرازی اور سخت گوئی سے پرہیز کرنے سے۔ لوگ طعن و تشنیع اور زبان تنقید دراز کرنے سے بہت خوش ہوتے ہیں، بعض تو یہاں تک آگے بڑھتے ہیں کہ افترا اور بہتان طرازی سے بھی نہیں گھبراتے۔ یہ باتیں یگانگت اور محبت کو مٹانے والی اور تنظیم کو توڑنے والی ہیں ان سے پرہیز کرنا چاہئے۔

ہندوستان میں مسلمان جن مصائب سے دوچار ہیں ان کا مقابلہ صبر و تحمل سے کرنا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ کے وفادار رہ کر شریعت اسلامیہ کو اپنے اوپر نافذ کر کے، اعدارِ دین کو مایوس کر دینا چاہئے کہ ان کی چیرہ دستیاں اسلامیان ہند کو اسلام سے ذرہ برابر بھی علیحدہ نہیں کر سکتیں۔

اگر ہم ایک امیر، ایک پلیٹ فارم اور ایک مقصد پر جمع ہو گئے اور ہم نے اپنے اندر سمع و طاعت کا جذبہ پیدا کر لیا اور ان سے علیحدہ ہو گئے جو یورپ کی نقالی کو کافی سمجھتے ہیں وہ بھی صرف شکل و صورت میں، وضع قطع میں، وہاں کی سائنسی ٹیکنیکی ترقیات سے ان کو کوئی واسطہ نہیں تو ہم ایک بڑی طاقت بن کر ابھریں گے۔

اگر ہم اللہ کے ہو گئے اور اس سے مغفرت و رحمت طلب کی تو اس کی تائید و حمایت کا نزول ہوگا اور وہ باغیوں اور ظالموں کو ہمارے ہاتھوں ذلیل و برباد کر دے گا۔

مسلمانوں کو عہد رسالت سے نمونہ حاصل کرنا چاہئے۔ کون سی تکلیف تھی جو کافروں نے اسلام کی راہ میں نہ ڈالی؟ لیکن اللہ کی راہ میں تکلیفیں ان کے لئے راحت تھیں۔ ذلتیں ان کے لئے عزت تھیں۔ رکاوٹیں محرک تھیں کہ زیادہ فعال، زیادہ باہمت اور زیادہ ثابت قدم بنیں۔ وہ سب کچھ سہتے تھے لیکن اسلام سے منہ نہیں موڑتے تھے۔ جب وہ آزمائش میں پورے اترے تو دنیا کی حکومتیں ان کی ٹھوکروں سے پامال ہوئیں، بادشاہوں کے تاج ان کے عظمت و جلال کے آگے ماند پڑ گئے۔

آیئے دنیا کے تمام وساوس سے یکسو ہو کر اللہ کی محبت دلوں میں پیدا کریں اور اسکا کلمہ بلند کرنے کیلئے دھڑ کی بازی لگا دیں

نیا ہجری سال ـ محرم کا مہینہ

ہجری سال جب ختم ہوتا ہے تو حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے ایک واقعہ کی یاد منا کر ہم تسلیم کرتے ہیں کہ انسان نے جو کچھ پایا حق کی حمایت میں جرأت کی راہ سے پایا ہے اور سال جب شروع ہوتا ہے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یاد کر کے ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ہم جو کچھ پائیں گے حق کی حمایت میں جرأت کی راہ سے پائیں گے۔

اس اوائل سال یعنی ماہ محرم میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واسطہ سے بنی اسرائیل کو فرعون کے ظلم و تعدی سے نجات دی تھی۔ فرعون ظالم بادشاہ تھا۔ اس کی قوم بھی درندگی اور بربریت میں دلیر تھی۔ اسرائیل کی قوم محکوم اور غلام تھی، بے بس اور بے طاقت تھی، ظلم سہنا اس کا کام تھا۔ اس قوم میں جو بیٹے ہوتے، فرعون ان کو قتل کرا دیتا اور جو بیٹیاں ہوتی تھیں ان کو چھوڑ دیتا تاکہ وہ ہمیشہ کمزور اور ذلیل رہیں اور رفتہ رفتہ نابود ہو جائیں اور یہ نہ ہو کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے مصر میں بنی اسرائیل کی سلطنت کی جو بنیاد رکھی تھی اس کی پھر تجدید ہو جائے۔ قوم فرعون کی طرح آج بھی بعض قومیں اپنے ہم وطنوں کو محض اس لئے مٹانے کی کوشش کرتی ہیں کہ کہیں وہ اپنی کھوئی ہوئی سلطنت کے پھر دعویدار نہ ہو جائیں حالانکہ ان ہم وطنوں نے تاریخ کے فیصلہ کو قبول کر لیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کو رحم آیا۔ اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس خدمت پر مامور کیا کہ وہ فرعون کو سمجھائیں اور بنی اسرائیل کو نجات کی راہ کی طرف لے جائیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل اور فرعون دونوں سے قریب تھے۔ فرعون کی بیوی حضرت آسیہ نے ان کی پرورش کی تھی اور وہ خود بنی اسرائیل سے تعلق رکھتے تھے۔ ان سے بڑھ کر اس خدمت کے لئے کون موزوں ہو سکتا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام پیغمبرانہ عزیمت کے ساتھ آگے بڑھے۔

فرعون کو سمجھایا، ڈرایا، معجزات سے اپنے دعوئے پیغمبری کی تصدیق کی۔ فرعون نہ سمجھا بالآخر غرق ہوا۔ نہ حکومت کے وسائل کام آئے اور نہ دولت کا جادو ہی سہارا بن سکا فرعون کی قوم میں سے ایک رجل صالح کے علاوہ حضرت آسیہ نے بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ساتھ دیا۔ اور ان کا ساتھ دیتے ہوئے مظلوموں کی حمایت کرتے ہوئے شاہی کبر و نخوت کا مقابلہ کرتی ہوئی شہید ہوگئیں۔ اس انقلاب میں ان کے نام کا آنا اس بات کا ثبوت ہے کہ عورتوں نے اپنا فرض ادا کرنے میں کبھی غفلت نہیں برتی ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جد و جہد اسلامی نقطۂ نظر سے بہت اہم ہے۔ قرآن کریم میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ بتکرار بیان ہوا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت سے جو تعلق تھا اس کی طرف خود قرآن نے یوں اشارہ کیا ہے:

انا ارسلنا الیکم رسولا شاھدا علیکم کما ارسلنا الیٰ فرعون رسولا۔

ترجمہ: ہم نے تمہاری طرف (اے اہل عرب) ایک رسول بھیجا ہے جو تم پر شاہد ہے جس طرح ہم نے فرعون کی طرف رسول بھیجا تھا۔

یہود بنی اسرائیل کی نجات کی خوشی میں بطور یادگار دسویں محرم کو روزہ رکھتے تھے۔ جب تک رمضان کا روزہ فرض نہ ہوا، حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس دن روزہ رکھتے تھے بلکہ ایک دن زیادہ کر کے رکھتے تھے۔ ایک اچھی حکومت کا قیام اور بری حکومت کا انسداد کتنا ضروری ہے اور مذہب کا سیاست سے کتنا لگاؤ ہے ان مسائل کو سمجھنے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جد و جہد سے ہمیں کافی مدد مل سکتی ہے۔

سبط رسول حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کا واقعہ بھی اسی ماہ محرم میں پیش آیا۔ یہ واقعہ بھی تاریخ کا اہم واقعہ ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے بعد خاندان بنی ہاشم کے کچھ لوگ خلافت کو بنی ہاشم میں رکھنا چاہتے تھے لیکن حضرت علی نے ابوبکر

کے ہاتھ پر بیعت کرلی اور حضرت امام حسن حضرت امیر معاویہ کے حق میں دست بردار ہو گئے ان دونوں واقعات نے خاندان بنی ہاشم کے حامیوں کے دعویٰ امارت کو کمزور کر دیا۔ اب امیر معاویہ نے لوگوں سے مشورہ کرنے کے بعد اپنے بیٹے یزید کو اپنے بعد خلیفہ نامزد کیا۔ چنانچہ معاملہ الٹ گیا۔ خاندانی خلافت کے حامی بنی ہاشم نہیں بلکہ بنی امیہ ہو گئے۔ مسلمانوں میں تین طرح کے لوگ تھے۔ ایک جماعت نے یزید کو خلیفہ خندہ پیشانی کے ساتھ مانا کیونکہ ان کے خیال میں حکومت چلانے کی استعداد بنی امیہ ہی میں تھی اور حضرت امیر معاویہ کی کارگذاری سے بھی اس کی تصدیق ہوئی تھی دوسری جماعت نے کراہیت کے ساتھ خلافت قبول کی کیونکہ باپ کے بعد بیٹا تخت پر بیٹھے۔ یہ ابوبکر و عمر کی سنت نہیں تھی بلکہ قیصر و کسریٰ کی سنت تھی۔ ایک تھوڑی سی جماعت مخالفت کے لئے تیار تھی۔ یہ کوفہ والوں کی جماعت تھی۔ حضرت علی نے کوفہ کو اپنی خلافت کا مرکز بنایا تھا۔ کوفہ کے لوگ جنگ صفین میں بری طرح تباہ ہوئے تھے۔ تقریباً ہر گھر کا نوجوان مارا گیا تھا۔ نقصانات کا ان کو احساس ہو گیا تھا کہ یہ لوگ حضرت علی کے قابو میں بھی نہیں رہے تھے۔ حضرت علی نہیں چاہتے تھے کہ حضرت امیر معاویہ سے صلح کریں۔ ان کی خواہش تھی کہ میدانِ جنگ ہی میں فیصلہ ہو جائے لیکن کوفہ والوں نے لڑائی سے گھائل اور پریشان ہو کر حضرت علی کو ثالثی پر راضی کیا۔ ثالثی کی ناکامی کے بعد حضرت علی نے پوری خطابت صرف کردی اور کوفہ والوں کو اس بات پر آمادہ کرنا چاہا کہ وہ لڑائی کے لئے نکلیں لیکن وہ نہ نکلے اور حضرت امیر معاویہ آسانی کے ساتھ تمام بلادِ اسلامیہ پر قبضہ کرتے رہے۔ ظاہر ہے، کوفہ کے لوگ یزید سے لڑ نہیں سکتے تھے، لڑنے کی ان میں طاقت نہیں تھی۔ جنگ صفین کو زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا۔ ممکن ہے کہ نوجوانوں کے ذہن میں جنگ صفین کے واقعے کا تصور اتنا ابھرا ہوا نہ ہو لیکن کوفہ کے سن رسیدہ مرد اور عورتیں جنگ کے بھیانک انجام سے واقف تھے۔ اور وہ اپنے بچوں کو پھر آگ میں کودنے کی اجازت نہیں دے سکتے تھے۔ اس لئے جب کوفہ کے کچھ لوگوں نے حضرت امام حسین کو دعوت دی کہ وہ آجائیں اور یزید سے لڑیں تو حضرت امام حسین کو یہ سوچنا چاہیئے تھا کہ یہ کوفہ والے ان کا کہاں تک ساتھ دے سکتے ہیں۔ مکہ کے کچھ صحابہ نے ان کو

مشورہ بھی دیا کہ وہ نہ جائیں کیونکہ حضرت علی کے ساتھ ان کا معاملہ اچھا نہیں رہا تھا۔ لیکن حضرت امام حسین کا دل کہتا تھا کہ یزید کی نامزدگی صحیح نہیں ہے اور اس کی مخالفت ہونی چاہیئے۔ چنانچہ وہ چل پڑے۔ راستہ میں ابن زیاد کی فوج مقابلہ کے لئے آگئی۔ ابن زیاد کوفہ کا گورنر تھا۔ امام حسین کو اطلاع مل چکی تھی کہ کوفہ والے ان کا ساتھ نہیں دیں گے۔ ابن زیاد کی معمولی دھمکی کامیاب ہو چکی تھی۔ اس لئے امام نے ابن زیاد کی فوج کے سامنے صلح کے لئے تین باتیں پیش کیں، ان کو واپس جانے دیا جائے یا یزید کے پاس افہام و تفہیم کے لئے جانے دیا جائے یا سرحد بلاد اسلامیہ کی طرف جانے دیا جائے۔ لیکن ابن زیاد کی فوج اس وقت تک کسی طرح کی مصالحت کرنے کو تیار نہ تھی جبتک کہ امام حسین یزید کی اطاعت کا اقرار نہ کرلیں۔ اس کے لئے حضرت امام حسین راضی نہ ہوئے۔ جس بات پر ان کا قلب مطمئن نہیں تھا اس کو محض دباؤ کی وجہ سے قبول نہیں کرسکتے تھے۔ چنانچہ جنگ ہوئی۔ تعداد میں ابن زیاد کی فوج کے لوگ زیادہ مارے گئے لیکن شکست امام حسین کی فوج کو ہوئی کیونکہ وہ قلیل التعداد تھی اور وسائل و ذرائع بھی نہیں تھے۔ مسلمانوں کی اکثریت یزید کو خلیفہ مان چکی تھی۔ اس لئے ان سے مدد ملنے کی کوئی امید نہیں تھی۔ بہرحال امام شہید ہو گئے۔ انہوں نے جان دے کر اس بات کی گواہی دے دی کہ حق کی حکومت نہ ہو تو بھی حق کا ہی ساتھ دینا چاہیئے۔ حکومت کا ساتھ نہیں دینا چاہیئے۔ ان کے نزدیک یزید کی حکومت حق کی حکومت نہیں تھی۔

آج کتنے ہیں جو حکومت کی اصلاح اور درستگی کے لئے اس حد تک نہیں صرف جائز طریقوں سے قانون کے اندر رہ کر کوشش کرنے کو تیار ہیں۔ آج امام حسین کا نام لینے والے اتنی جرارت بھی نہیں رکھتے۔ صرف تملق اور چاپلوسی کو انہوں نے اپنا شیوہ بنا رکھا ہے۔

انسان بھی کتنا عجیب ہے یا تو اس نے امام حسین کے خون سے اپنے ہاتھ رنگ لیئے، ان کو بچانے کی کوشش نہیں کی یا اب گریہ و بکا ہے، واویلا ہے، سینہ کوبیاں ہیں، عزاداریاں ہیں، قاتلوں کے نام گالیاں ہیں جس کا حاصل اس کے سوا کچھ

نہیں کہ تیرہ سو برس قبل کے واقعات کو بنیاد بنا کر کچھ لوگوں کے خلاف نفرت پیدا کی جائے اگر آج ایسے لوگوں کو حضرت امام حسین کی پیروی کرنے کو کہا جائے تاکہ حق سربلند ہو، باطل سرنگوں ہو تو وہ معذرتیں اور مصلحتیں پیش کر کر کے پیچھا چھڑائیں گے۔ حکومت کی خوشامد کر کے آرام کرسیاں حاصل کریں گے۔

سیدنا امام حسین کے غم میں جو کچھ کیا جاتا ہے کیا وہ خود کبھی اس طرح کسی کا غم مناتے تھے ان کے نانا کا انتقال ہو گیا جو کائنات میں اللہ تعالیٰ کے بعد سب سے اونچا مقام رکھتے تھے اور جن سے محبت کرنا ایمان کی شرط اور ذریعۂ نجات ہے اور جن کا ارشاد ہے کہ تم میں سے کسی کو جب کوئی صدمہ پہنچے تو میری موت کو یاد کرو کیونکہ میری موت سے بڑھ کر میری امت کے لئے کوئی دوسرا حادثہ نہیں۔ لیکن کسی نے کہیں کسی کتاب میں پڑھا ہے یا کوئی روایت سنی ہے کہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے حضور کے انتقال کے بعد حضور کا تعزیہ بنایا ہو، ہر سال ۱۲ ربیع الاول کو ماتمی جلوس نکالا ہو یا کم از کم اپنی صورت ہی روئی بنایا ہو، علم گاڑے ہوں، ان کی عورتوں نے بال بکھیر دیئے ہوں، سینہ کوبی کی ہو، مرثیے پڑھے ہوں، عزا کی مجلسیں منعقد کی ہوں سیاہ کپڑے زیب تن کئے ہوں؟

جگر گوشۂ رسول فاطمہ زہرا کا انتقال ہوا کیا یہ سب ان کے لئے بھی ہوا۔ حضرت امام حسین کے والد سیدنا حضرت علی کی شہادت بھی ہوئی۔ انہیں بھی معرکے پر، کے پیش آئے کیا ان کی مظلومی پر حسنین رضی اللہ عنہما نے ہر سال ماتم کیا سینہ کوبی کی، جلوس نکالے تعزیے بنائے، سیاہ کپڑے پہنے، عزا کی مجلسیں منعقد کیں؟

اگر امام حسین نے ہر سال کسی کا سوگ نہیں منایا اور اپنے عمل سے یہ بتایا کہ کسی مسلمان کے لئے تین دن سے زیادہ سوگ منانا جائز نہیں اور جو تہِ خنجر بھی مسکراتے رہے تو غور کرنا چاہئے کہ ان کے نام پر ان کا مذاق تو نہیں اڑایا جا رہا ہے، ان کی توہین تو نہیں کی جا رہی ہے۔ ان کی پیروی سے انحراف تو نہیں ہو رہا ہے۔

اسلام نے لہو ولعب کو ہی منع کیا تھا۔ یہ کون جانتا تھا کہ لوگ اسلام کو اور اکابر اسلام

کو لہو ولعب کا ذریعہ بنالیں گے۔ اور محرم کو حضرت امام حسین کی یاد میں اکھاڑوں، تعزیوں کھچڑے اور پلاؤ اور جشن کا مہینہ قرار دیں گے۔

اگر امام حسین کی پیروی کا شوق ہے تو بہادری اور شجاعت کے ساتھ حق کا ساتھ دینا چاہیئے۔ آج بھی نہ جانے کتنے باطل ہیں جن کو مٹانا ہے۔ آج بھی دنیا ابوبکر و عمر کی خلافت کا نمونہ دیکھنا چاہتی ہے۔ اس نمونہ کو قائم کرنا چاہیئے اور امام حسین کی روح کو خوش کرنا چاہیئے جنہوں نے اس نمونہ کے خلاف نظامِ حکومت کو نہیں مانا۔ حضرت حسین نے اس نظامِ حکومت کو قائم کرنے کے لئے جان دی جسے ابوبکر و عمر نے قائم کیا تھا

میری میں فقیری میں شاہی میں غلامی میں
کچھ کام نہیں بنتا بے جرأتِ رندانہ

بہادری ــ موجودہ مسئلہ کا حل

مرنا برحق ہے۔ مقررہ وقت ٹلتا نہیں ہے۔ موت کی گھڑی جب آتی ہے تو چھٹکارا کس کو ملتا ہے۔ پیامِ اجل کو لبیک کہنا پڑتا ہے۔ جو بے دلی سے جان دیتے ہیں وہ اپنی اور قوم کی بربادی کا سبب بنتے ہیں اور جو خوشی سے مرتے ہیں اور دنیا کی زندگی پر آخرت کی زندگی کو ترجیح دیتے ہیں ان کے لئے موت امرت ہے۔ ھم احیاء ولاکن لا تشعرون۔

جب تک کسی قوم میں خوشی سے مرنے کا جذبہ بیدار رہتا ہے اس وقت تک وہ قوم زندہ رہتی ہے ۔ اس کو شکست بھی ہوتی ہے اور فتح بھی لیکن اس کے وقار اور اس کی عزت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ وہ قوم دنیا میں بھی عزت کی زندگی گذارتی ہے، لیکن جب خوشی سے مرنے کا شوق باقی نہیں رہتا تو وہ قوم مردہ ہو جاتی ہے، دوسری قومیں اسے ذلیل کرتی ہیں۔ ہم نے ماضی میں بے دلی سے مرنے کا کافی تجربہ کیا ہے۔ اب ہم ذوق وشوق سے مرنے کا تجربہ کریں۔ انشاء اللہ یہ تجربہ کبھی ناکام نہ ہوگا۔ جب کبھی ہماری زندگی کو چیلنج کیا جائے تو ہمارا فرض ہوگا کہ ہم جذبۂ بے اختیار شوق میں سر ہتھیلیوں پر لے کر آگے بڑھیں۔ قید وبند ہو یا گولوں کی باڑھ یا پھانسی کے تختے، یہ سب ہمیں محبوب اور پیارے ہوں۔ ان کی طرف ہم ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کریں۔ نجات پانے کی صرف ایک ہی راہ ہے۔ موت ہم سے منہ پھیر لے ہم موت سے منہ نہ پھیریں۔

یہ جرأت، یہ بہادری ، یہ موت کی آنکھوں سے آنکھیں ملانا ان جوانوں کا کام ہے جو زندگی کی حقیر خواہشات سے اور عیش وعشرت سے اپنے کو آزاد کر لیتے ہیں

تن آسانیاں چھوڑ دیتے ہیں۔ دنیا کی محبت دلوں سے نکال دیتے ہیں۔ مشقتوں اور اذیتوں کے عادی ہو جاتے ہیں۔ ہر طرح کی تکلیفیں سہتے اور ہر طرح کی راحتوں سے مستغنی ہو جاتے ہیں۔ ان کے اخلاق میں بلندی ہوتی ہے اور ان کے کردار میں صفائی۔

یاد رکھئے ؎

تن آسانیاں چاہیں اور آبرو بھی
وہ قوم آج ڈوبے گی گر کل نہ ڈوبی

بے شک اگر کل وہ قوم کسی طرح تباہ ہونے سے بچ گئی تھی تو آج کے حالات بتا رہے ہیں کہ اسے نیست و نابود ہونا ہے۔ ہر روز پیش آنے والے واقعات مسلمان اخبارات میں پڑھتے ہیں۔ دوسروں کی چیرہ دستیوں کے مقابلہ میں بہادری کا مظاہرہ ان کے مسئلہ کا حل ہے۔

ہماری عید

رمضان کے پورے ماہ روزے رکھنے کے بعد ہماری عید آتی ہے۔ ہم جس بنا پر عید مناتے ہیں اور جس طرح عید مناتے ہیں دونوں سبق آموز ہیں۔ ہمارے لئے بھی اور دوسری قوموں کے لئے بھی۔

ہلال عید ہمیں بتاتا ہے کہ خوشی کیوں منائی جائے اور کس طرح منائی جائے۔

اسلام نے جس معاشرے کی بنیاد رکھی تھی، لازم تھا کہ خوشی اور غم کی بنیادوں اور طریقوں کی بھی نشاندہی کر دی جائے۔ ہمارے دو تہوار عید الفطر اور عید الاضحےٰ جشن و مسرت کے فلسفہ اور طریقہ کا اظہار ہیں۔

یہ دنیا چند روزہ ہے۔ ہر چیز یہاں مٹنے والی ہے۔ اس سرائے فانی میں جو آیا ہے وہ جائے گا۔ بقاء و قرار کسی کو نہیں ہے۔ یہ محض ایک خبر نہیں ہے، بلکہ مشاہدہ اور واقعہ ہے۔ جب سے دنیا بنی اس وقت سے اب تک لوگوں نے مشاہدہ کیا ہے کہ نبی آئے حق کی تبلیغ کی اور دنیا سے چلے گئے۔ علماء و صلحاء لوگوں کو تعلیم دیتے رہے اور پھر آغوش لحد میں سو گئے۔ بڑے بڑے فاتح حکمراں، بڑے بڑے حکماء اور دانشمند پیدا ہوئے، دنیا سے اپنی بڑائی اور عظمت کا سکہ منوایا لیکن موت کے پنجے سے نہ بچ سکے اور خاک میں مل کر خاک ہو گئے۔ بڑی بڑی جبار قوتوں نے سر اٹھایا، اپنی کثرت و قوت پر نازاں ہوئے لیکن ابتداد زمانہ نے ان کا بھی نشان باقی نہ رکھا۔ عالی شان عمارتیں، پر شوکت شہر مسمار و ویران ہو گئے۔ اس لئے خوشی درحقیقت اس بات میں نہیں کہ زید کے گھر میں لڑکا پیدا ہوا ہے، بکر کے گھر

گھر میں شادی ہے، عمر کی مالی حالت بہت اچھی ہو گئی ہے، ہمارا ملک طاقتور ہو گیا ہے ہماری قوم پُر ہیبت بن گئی ہے، یہ سب چیزیں فانی ہیں۔ خوشی تو درحقیقت اس کی ہونی چاہئے کہ ہم نے آخرت کے لئے کچھ کر لیا ہے، ہم دوسری زندگی کو خوشگوار بنانے کا سامان کر چکے ہیں، ہم خدا کے روبرو سرخرو ہو کر جانے کی صورتیں نکال چکے ہیں۔ اگر ہم یہ سب کر چکے ہیں تو ہمیں خوش ہونا چاہئے۔ کیونکہ "والاخرۃ خیر وابقیٰ" جو کامیابی ٹھیرنے والی اور باقی رہنے والی ہے، حقیقت میں خوشی اسی پر ہونی چاہئے عالم ناپائیدار کی عارضی کامیابیوں پر اترانا مناسب نہیں۔

رمضان کا مہینہ روزوں کا مہینہ ہے۔ مسلمان اللہ کا فرمانبردار، اپنے کو اس کی مرضی کے سپرد کر دینے والا، دن بھر نہ کھاتا ہے، نہ پیتا ہے، نہ اپنی بیوی کے پاس جاتا ہے۔ اس لئے نہیں کہ وہ اللہ کی نعمتوں سے محروم ہے بلکہ اس لئے کہ یہ باتیں ابھی اللہ کی مرضی کے خلاف ہیں، جب اس کی مرضی ہوگی تو کھائے گا، پئے گا اور اس کی تمام نعمتوں سے فائدہ اٹھائے گا۔ اس کو اپنی مرضی سے کچھ نہیں کرنا ہے۔ اسلام کے معنی ہیں اپنے آپ کو سپرد کر دینے کے۔ بس اس نے اپنے کو اللہ کی مرضی کے تابع کر لیا ہے۔ وہ روزہ رکھے ہوئے ہے۔ اس نے اپنی نمازیں زیادہ کر دی ہیں، سجدوں کی تعداد بڑھا دی ہے، توبہ و استغفار میں مشغول ہے تمام مہینوں سے زیادہ اس مہینے میں وہ نیکیوں کا حریص ہے۔ اور اس طرح خدا کو راضی کرنے کی طلب و جستجو، سعی و جہد میں پورا مہینہ گذارتا ہے اور آخر میں بشارتِ ربانی "ان الذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا" کی بنا پر امید اور توقع رکھتا ہے کہ اس نے کچھ کما لیا ہے، اس کی جیب میں کچھ نقد جنس آگئی ہے اور وہ زادِ راہ مل گئی ہے جس سے وہ سفرِ آخرت کی منزلیں طے کرے گا تو اسے خوشی ہوتی ہے اور یہ عید اسی خوشی کے اظہار کا دن ہے۔

پھر خوشی بھی کس طرح منائی جاتی ہے؟

لوگ اس طرح بھی خوشیاں مناتے ہیں کہ شادیانے بجائے جاتے ہیں، ناچ اور

اور رقص کی مجلسیں سجائی جاتی ہیں، شراب پی کر مستیوں کو دعوت دی جاتی ہے، جلوس نکالے جاتے ہیں، گالیاں بکی جاتی ہیں، عورتوں کو چھیڑا جاتا ہے، ملنے والوں پر رنگ اور غلاظت ڈالی جاتی ہے۔ اس طرح کی خوشیاں اور سرمستیاں ہمارے لئے اجنبی نہیں ہیں۔ ہر سال ان انسانیت سوز مظاہروں کو آنکھیں دیکھتی ہیں لیکن یہ سب دیکھ کر بھی ہم اپنی عید ان نادانوں کی طرح نہیں مناتے۔ عید میں ہم غسل کرتے ہیں، جو اللہ نے دیا ہے وہ کپڑے پہنتے ہیں۔ اپنے غریب بھائیوں کو اپنی خوشی میں شریک کرنے کے لئے فطرہ کے نام سے نقد یا غلہ کی شکل میں ان کی مدد کرتے ہیں تاکہ وہ بھی نئے کپڑے بنالیں اور اپنے کھانے کا نظم کرلیں۔ خود کھاتے اور احباب کو کھلاتے ہیں اور سب ایک جگہ جمع ہو کر اللہ تعالیٰ کے روبرو سجدہ شکر بجالاتے ہیں کہ اسی نے تقویٰ اور طہارت کی توفیق بخشی۔ اس طرح اللہ اور بندے کے درمیان رشتہ مضبوط کرتے ہیں تاکہ آئندہ اللہ کے راستہ سے ہمارے قدم پھسلنے نہ پائیں اور ہم اللہ کے بندوں سے غافل ہو کر اور ان کی ضرورت میں کام نہ آکر خود غرضی کا راستہ نہ اختیار کرلیں۔ ہم نے عید کے دن جس سخاوت اور غربا پروری کا مظاہرہ کیا ہے وہ جاری رہے۔ پھر آپس میں ایک دوسرے کو اس نعمت عظمیٰ پر مبارکباد دیتے ہیں۔ خوشی منانے کا ہم مسلمانوں کے یہاں یہی معیاری طریقہ ہے۔

ہم خاص طرح پر عید مناکر دراصل دنیا کو یہ تعلیم دیتے ہیں کہ خوشی اس بات پر مناؤ اور اس طرح مناؤ۔

ہماری بدبختی یہ ہے کہ ہم نے نہ صرف تمام موقعوں کو غیر اسلامی طریق شادمانی سے آراستہ کرلیا ہے بلکہ خود عید منانے کا جو مسنون طریقہ ہے اس کو بھی ہم چھوڑتے جارہے ہیں۔ خطرہ یہ ہے کہ آنے والے زمانہ میں لوگوں کے سامنے یہ نمونہ بھی نہ رہے۔

جب رمضان آتا ہے، جب عید آتی ہے تو عرب ایک دوسرے کو کہتے ہیں "عائدین انشاء اللہ" یعنی یہ غنیمت موقعہ انشاء اللہ بار بار آئے گا کہ ہم اللہ

کو راضی کرنے اور اپنے بھائیوں کے دکھ درد کو سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ اور جب یہ کوشش کریں گے تو اس کی خوشی بھی منائیں گے کہ اللہ نے یہ موقعہ دیا کہ ہم کوشش کر سکے۔ عید کے اصل معنی "لَوٹنے" کے ہیں۔ یہ نادر موقعہ لوٹ لوٹ کر آتا ہے اور کہتا ہے کہ تم نے اللہ کو راضی کرنے کی کوشش کی تو تم اس کا شکر بجا لاؤ اور اس کے آگے سجدہ کرو کہ اسی کی توفیق سے تم ایسا کر سکے۔

عیدِ قرباں

آج سے پانچ ہزار سال قبل اس آسمان کے نیچے حضرت ابراہیم کی جد و جہد کا مشاہدہ اس کرۂ ارض کے چھوٹے سے حصے میں کیا گیا تھا۔ انہوں نے دیکھا کہ چاند کی سورج کی، ستاروں کی، دریا کی اور پہاڑوں کی قدر ہے، انسان ان کی عبادت کرتے ہیں۔ لیکن قدر و منزلت نہیں ہے تو خود حضرت انسان کی۔ یہ انسان اپنے ہاتھوں آپ ذلیل ہو رہا ہے اور گمراہی میں مبتلا ہے۔ حضرت ابراہیم کو یہ بات پسند نہ تھی۔ وہ ان لوگوں میں نہ تھے جو زمانہ کے پیچھے چلتے ہیں بلکہ ان لوگوں میں تھے جن کو قدرت زمانہ کو بدل دینے کے لئے بھیجتی ہے۔ جن کی ٹھوکروں سے نیا زمانہ وجود میں آتا ہے اور جو عزیمت کا نقش رہتی دنیا تک چھوڑ جاتے ہیں۔

حضرت ابراہیم نے نوعِ انسان کی اس توہین کے خلاف سخت احتجاج کیا کہ اس کی پیشانی غیر اللہ کے آگے جھکے اور اسے غیر اللہ کی دہلیز پر بھینٹ چڑھایا جائے انہوں نے سماج کی سخت گیریوں کی پرواہ نہ کی۔ انہوں نے ستاروں، چاند اور سورج کے طلوع و غروب سے استدلال کیا کہ یہ خدا نہیں ہو سکتے۔ جو اجرام فلکی ایک نظام کے تحت متحرک ہیں اور ذرہ برابر اس نظام میں فرق کرنے کی قدرت نہیں رکھتے وہ خدا کیوں کر ہو سکتے ہیں۔ انہوں نے بتوں کو توڑ کر کے بتایا کہ یہ بے طاقت ہیں انہوں نے آگ میں کود کر یہ ثابت کیا کہ نفع و نقصان دونوں خدا کے اختیار میں ہیں انہوں نے ایک خواب دیکھا اور نبی کا خواب جھوٹا نہیں ہوتا کہ اپنے بیٹے کو ذبح کر رہے ہیں۔ ان کے قلب نے اس بات کی تصدیق کی کہ اگر انسان کی جان کو نذر کرنا ہی ہے تو ایک اللہ کی ذات اس کی زیادہ مستحق ہے۔ مٹی کی مورتیاں اس کا حق نہیں رکھتیں۔

انہوں نے بیٹے کو خواب کی اطلاع دی، ان کو راضی پاکر انہیں لٹایا اور قریب تھا کہ ان کے گلے پر چھری چلائیں، یہاں تک کہ اللہ کی نشانی ظاہر ہوئی اور بجائے بیٹے کے دنبہ ذبح ہو گیا۔ یہ آخری منظر اس بات کی شہادت ہے کہ انسان کی جان علامتی اور رواجی قربانیوں کے لئے نہیں ہے۔ یہ اس لئے نہیں کہ اسے بے وجہ اللہ کے نام پر ہی کیوں نہ ہو محض علامتی طور پر قربان کر دیا جائے۔ اللہ کا فرمانبردار بندہ اس لئے ہے کہ وہ اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لئے، فتنہ و فساد کو مٹانے کے لئے دن رات ایک کر دیئے یہاں تک کہ یا وہ کامیاب ہو جائے یا اللہ کے دشمن اس کا کام تمام کر دیں ان کی اس قربانی کو اللہ تعالیٰ قبول فرماتا ہے۔ اس کی اس جدوجہد کی قیمت ہے، اس کی ان قربانیوں کا معاوضہ ہے، اس کی جان کے بدلے جنت کا انعام ہے۔ اللہ کی راہ میں مرنے والوں کی حیات دائمی ملتی ہے۔ اس کی راہ میں مرنے والے وہی ہیں جو اس کی مخلوق کو شرک سے اور دوسری بری باتوں سے روکتے ہیں اور اس کے بدلے ان کو قتل کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ تک گوشت نہیں پہنچتا، صرف تقویٰ پہنچتا ہے۔ اور عمل پہنچتا ہے۔ عمل سے مراد خود بدی سے اجتناب کرنا اور دوسروں کو روکنا ہے

حضرت ابراہیم کو یہودی، عیسائی اور مسلمان سب پیغمبر مانتے ہیں۔ ان کی یاد منانا در اصل قرآن حکیم کی اس دعوت کے عین مطابق ہے کہ جو اہل کتاب کے سلسلہ میں آتی ہے اور وہ یہ کہ تعالوا الی کلمۃ واحدۃ آؤ اس ایک کلمہ کی طرف جو ہم میں اور تم میں مشترک ہے۔ ہندوؤں کے یہاں بھی لفظ براہما موجود ہے۔ کیا اچھا ہو کہ حضرت ابراہیم کی بتائی ہوئی سچائی کو ہم سب مل کر پکڑلیں اور وہ سچائی یہ ہے کہ ایک اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں، نہ جمادات کی نہ نباتات کی نہ حضرت انسان کی نہ نمرود بادشاہ کی، نہ بڑی طاقتوں کی۔ سب انسان برابر ہیں۔ سب آدم کے بیٹے ہیں۔ ایک خدا کی ذات کے سوا ہر شے مخلوق ہے۔

دس ذی الحجہ کو ہم حضرت ابراہیم کے اس واقعہ کی یاد مناتے ہیں۔ جانوروں کی قربانی کرتے۔ گوشت خود کھاتے اور دوسروں کو کھلاتے اور غریبوں کو دیتے ہیں۔ گوشت

دنیا میں ہر جگہ اور ہمیشہ سے لوگ کھاتے آئے ہیں۔ ہندوستان کی اکثریت بھی کھاتی رہی ہے اور ہمیشہ سے کھاتی آئی ہے اس لئے انسان کی یہ بین الاقوامی غذا ہے۔ ایک بین الاقوامی تہوار میں اس شخص کی یاد مناتے ہیں جسے دنیا کے اکثر مذاہب مانتے ہیں، اس سے بہتر قربانی اور اس سے بہتر دعوت کوئی اور نہیں ہوسکتی تھی۔ قربانی کے علاوہ مسلمان اچھے کپڑے پہن کر غسل کر کے عطر لگا کے ایک جگہ جمع ہوتے ہیں۔ اللہ کو سجدہ کر کے اس کی عبادت کر کے اس سے اپنا رشتہ مضبوط کرتے ہیں۔ اگر اللہ کا خوف اور اس کی محبت دلوں میں بیٹھ جائے اور یہ یقین جاگزیں ہو جائے کہ وہ سب کے اعمال سے واقف رہتا ہے تو کوئی گناہ کرے ہی نہیں۔ اصلِ دین یہ ہے کہ خدا کا خوف اور اس کی محبت دلوں میں بیٹھ جائے۔

آیئے اس تہوار کو مناتے ہوئے ہم عہد کریں کہ ہم خدا کی مخلوق کی خدمت کریں گے اور اس کو اچھے راستہ پر لانے کے لئے کسی خطرہ کی پرواہ نہیں کریں گے۔ باطل کا دبدبہ ہمیں مرعوب نہیں کرے گا۔ جب ہم باطل نظریات کے اندھیرے میں کھڑے راہ ڈھونڈ رہے ہوں اور نشانِ منزل گم ہو۔ جب انسان انسان کے خون کا پیاسا ہو، تو حضرت ابراہیم کی دکھائی ہوئی روشنی ہمیں اندھیرے سے اجالے میں لائے گی۔ قوم ابراہیم نے حضرت ابراہیم کو آگ میں ڈال دیا تھا لیکن یہ آگ ان کے لئے ٹھنڈک اور سلامتی بن گئی۔

دنیا کو ابراہیم کی اسی جرأت اور عزیمت کی ضرورت ہے ؎

آج بھی ہو جو براہیم کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

مسیحیت ہندوستان میں

عیسائیوں کے مختلف فرقے ساٹھ کروڑ تیس لاکھ ساٹھ ہزار کی تعداد میں سارے کرۂ ارض پر پھیلے ہوئے ہیں۔ اس لحاظ سے دنیا میں عیسائیوں کی اکثریت ہے۔ تعداد کے ساتھ ساتھ سیاسی اور معاشی لحاظ سے بھی عیسائی دنیا کی سب سے طاقتور قوم ہیں۔ کوئی ایسا ملک نہیں جہاں عیسائی نہ ہوں لیکن وہ ممالک جہاں ان کو سیاسی طاقت بھی حاصل ہے، درج ذیل ہیں:

امریکا، فرانس، برطانیہ، سویڈن، ہالینڈ، جرمنی، سویٹزرلینڈ، بلجیم، ہسپانیہ، پرتگال، کناڈا، آئرلینڈ، برازیل، میکسکو، ارجنٹائن، فن لینڈ، اٹلی، ڈنمارک، آسٹریلیا، جنوبی افریقہ۔

اشتراکیت کے اثر سے عیسائیت کے چند قدیم آشیانے سیاسی طور پر ویران ہوگئے ہیں۔ جیسے روس، پولینڈ، ہنگری، آسٹریا، زیکوسلواکیا، یوگوسلاویہ حبشہ وغیرہ۔ لیکن ان میں آبادی عیسائیوں کی ہے۔ تھوڑے مسلمان بھی ہیں۔ روس میں سب سے زیادہ ۱۹ کروڑ عیسائی اور سات کروڑ مسلمان ہیں۔ ہندوستان میں اکیاسی لاکھ ستاون ہزار سات سو پینسٹھ عیسائی ہیں۔

عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی امت ہیں۔ ان کے بعد کسی نبی کو نہیں مانتے۔ حضرت عیسیٰ وحی الٰہی کی بنیاد پر یہودی معاشرہ کی اصلاح کرنا چاہتے تھے جس میں جمود، رسم پرستی، نسب کا غرور تھا اور جن کے اندر معاشی لحاظ سے طبقات بن گئے تھے۔ ان کے مذہبی پیشوا ذاتی مفاد کی بنا پر احکام الٰہی کو ادل بدل کرتے رہتے تھے کیونکہ ان پیشواؤں کے سوا کوئی دوسرا تورات کو پڑھنے کا حق نہیں رکھتا تھا۔ حضرت عیسیٰ کی تبلیغ سے پہلے کچھ صالح افراد پیدا ہوئے اور انہوں نے اونچ نیچ کے اس نظام کے خلاف احتجاج کیا لیکن ارباب اقتدار نے ان کی گردن اڑا دی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی دعوت شروع کی تو ان کو سخت مخالف ماحول کا پورا

احساس تھا۔ انہوں نے اپنی دعوت اس طرح شروع کی:

"اپنے دشمنوں سے محبت کرو۔"

"اگر کوئی تمہارے داہنے گال پر طمانچہ لگائے تو تم اپنے بائیں گال کو بھی پیش کر دو۔"

"جو تلوار اٹھاتے ہیں وہ تلوار ہی سے مارے جائیں گے۔"

جو اقتدار اور دولت سے شاد کام تھے، دوسروں سے نفرت کرتے تھے، اپنی بلند حیثیت اور سرداری امت پر فخر و غرور کرتے تھے، ان کے لئے حضرت عیسیٰ کی تعلیمات توحید، مساوات اور غیر محدود محبت پریشان کن تھیں۔ یہودی ان سے محبت کیسے کر سکتے تھے جن کو ذلیل سمجھتے تھے۔ ان کو برابری کا درجہ کیسے دے سکتے تھے جن مذہبی رہنماؤں نے اپنے کو خدا کی طرح مقدس قرار دے لیا تھا، رب کہلاتے تھے وہ توحید خالص کا پیغام سن کر منہ نہیں بنائیں گے تو اور کیا کریں گے؟ وہ بھی جب حضرت عیسیٰ دعوت دیں جو بن باپ کے پیدا ہوئے تھے اور یہودی یہ ماننے کو تیار نہ تھے کہ کوئی بن باپ کے پیدا ہو سکتا ہے۔ وہ حضرت مریم کو طاہرہ ماننے پر تیار نہ تھے۔ یہودیوں کا یہی فخر و غرور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ماننے میں بھی حائل ہوا کیونکہ حضورؐ حضرت ہاجرہ کی اولاد سے تھے اور یہودی ان کو حضرت سارہ کے برابر نہیں سمجھتے تھے۔ خود کو حضرت سارہ کی اولاد کہتے تھے۔

بہر حال حضرت عیسیٰ کی مخالفت شروع ہوئی۔ روم کی مشرک سلطنت کے کان بھرے گئے۔ حکومت کی مشنری نے حرکت کی۔ حضرت عیسیٰ نے گلیلی کا علاقہ چھوڑ دیا۔ اور بیت المقدس چلے گئے تاکہ محفوظ ہو کر اپنے حواریوں کے ساتھ "حکومت الٰہی" کے قیام کی کوشش کریں۔ بیت المقدس میں ان کو مقبولیت حاصل ہوئی تو ان کے دشمن بھی بڑھے۔ روم کے فوجی گورنر نے دیکھا کہ یہ قیصر کی حکومت کے بجائے "اللہ کی حکومت" کے قیام کی تبلیغ کرتے ہیں، قیصر کی اطاعت کی جگہ آپ اپنی اطاعت کا مطالبہ کرتے ہیں تو ان کے خلاف تادیبی کارروائی شروع ہوئی حوارین

پکڑے گئے۔ جنہوں نے جرأت دکھائی وہ مارے گئے۔ جو ڈر ے انہوں نے توبہ کی اور چھوڑ دیئے گئے۔ حضرت عیسیٰ کو اللہ نے اٹھالیا۔ کوئی ان کو پا نہ سکا تو خبر گرم ہوئی کہ وہ پھانسی دے دیئے گئے

حضرت عیسیٰ علیہ السلام سمجھتے تھے کہ ان کی کڑوی گولی یہودی سماج سے گھونٹی نہیں جائے گی۔ دین خالص تلوار کی طرح یہودی سماج کے امن وچین کو رخصت کردے گا۔ سچائی اور محبت کی جنگ ہر گھر میں لڑی جائے گی چنانچہ حضرت عیسیٰؑ کو اللہ نے اٹھالیا۔ درج ذیل خطبہ حضرت مسیح کا ہے۔ بہت ہی معنی خیز ہے۔ گو ممکن ہے تحریف کے ساتھ ہو۔

"ایسا خیال مت کرو کہ میں زمین پر امن قائم کرنے آیا ہوں۔ میں تلوار لایا ہوں، چین نہیں لایا ہوں۔ میں اس لئے آیا ہوں کہ باپ کو بیٹے کے خلاف کردوں۔ بیٹی کو ماں سے لڑا دوں۔ بہو کو کہوں کہ ساس سے لڑ جا۔ ہر گھر میدان جنگ ہوگا۔ تمہارے دشمن تمہارے گھر والے ہونگے پس وہ میرا نہیں ہے جو اپنے والدین کو مجھ سے زیادہ جانے اور نہ وہ میرا ہے جو اپنی اولاد کو مجھ سے زیادہ پیار کرے۔ وہ میرا نہیں ہے جو میری پیروی نہ کرے۔ جس نے اپنی جان بچائی اس نے اپنی جان کھوئی اور جس نے میرے لئے اپنی جان کھوئی اس نے اپنی جان پالی۔"

بہرحال حضرت عیسیٰ اٹھالئے گئے۔ ان کی مفصل سوانح بھی صفحۂ قرطاس پر موجود نہیں ہے۔ ان کے حواری ان کی تعلیمات کی شہادت دینے کو تیار نہ تھے۔ زمانہ دراز کے بعد حضرت عیسیٰ کی مظلومی رنگ لائی۔ ان پر ایمان لانے والوں میں اضافہ ہوا تو ان کی تعلیمات کی کھوج ہونے لگی اور مستند اور غیر مستند جو خبریں بھی مل سکیں ان کو انجیل ہی کے نام سے جمع کیا گیا اور پھر اس کتاب کو لے کر عیسائی مشنریاں دنیا کے کونے کونے میں پہنچیں۔

ہندوستان میں مسیحیت کے نقوش آج سے پندرہ سو برس پہلے ملاقہ

مالابار میں ملتے ہیں اس زمانہ میں عیسائی تجارتی اغراض سے یہاں آئے تھے۔ ان کو شامی عیسائی کہا جاتا تھا۔

۱۲۹۱ء میں پوپ نے جان ڈی مانٹی کارنی ووڈ کو مسیحیت کی اشاعت کے لئے چین بھیجا تھا۔ کارنی ووڈ نے چین جانے سے قبل ۱۳ ماہ تک ہندوستان میں قیام کیا تھا۔ اس عرصہ میں اس نے سو منتخب اشخاص کو عیسائی بنایا تھا۔ اس کے بعد ۱۳۲۳ء میں ڈومی نیکن فرائز ایک فرانسیسی کی قیادت میں تبلیغی مشن آیا اور چودھویں صدی کے اندر ہی بمبئی سے ٹراونکور تک ساحلی علاقوں میں عیسائی مشن کا ایک سلسلہ قائم ہو گیا۔

۱۹۱۰ — ۱۹۱۵ء میں الفانسو البسرقی نے پرتگالی سلطنت کی ہندوستان میں بنیاد رکھی اور گوا سے لنکا تک اپنے قلمرو میں شامل کر لیا اور سارے مغربی ساحل میں مسلمانوں کے خون اور ہڈیوں پر عیسائی اقتدار کی عمارت کھڑی کر دی۔ الفانسو شاہِ پرتگال کو تسخیر گوا کی یوں خبر دیتا ہے:

"میں نے شہر کو جلا ڈالا۔ ہر چیز کو تلوار کی نذر کیا اور مسلسل کئی دن تک جہاں بھی آپ کے آدمیوں نے کسی مسلمان کو پالیا اس کے خون سے اپنی پیاس بجھائی۔ مسجدوں میں مردوں کو بھر کر آگ لگا دی۔ میرا اندازہ ہے کہ چھ ہزار مسلمان مرد اور عورتیں قتل کئے گئے۔ یہ جنگ بہت کامیاب رہی۔ اچھی طرح لڑی گئی اور اچھی طرح ختم کی گئی۔ میں نے کسی مقبرے کو اور کسی عمارت کو مسلمانوں کے باقی نہیں رکھا۔ اب بھی جو مسلمان پکڑا جاتا ہے اس کے قتل کا حکم دیتا ہوں۔"

جنگ میں ایک دوسرے کو قتل کرنا اور ان کی املاک کو برباد کرنا قدیم دستور ہے لیکن قبروں اور عبادتگاہوں پر اپنا غصہ نکالنا یورپین اقوام کی سنت ہے جن کو اپنے عیسائی ہونے پر فخر ہے۔ روس میں ترکوں کے علاقہ پر زار روس نے قبضہ کیا تو وہاں بھی یہی ہوا کہ ہزاروں مسجدیں گرادی گئیں۔ یہی طریقہ ہندوستان کے بعض فرقہ پرستوں نے

بھی اختیار کیا ہے۔

بہر حال الفانسو نے گوا پر قبضہ کرکے لوگوں کو بالجبر عیسائی بھی بنایا لیکن شاہ پرتگال کو سیم وزر کی بوریاں درکار تھیں۔ محض مسیحی بھیڑوں سے اس کی تسکین نہیں ہوئی چنانچہ اس نے فرانسس اگزیویر کو ہندوستان بھیجا۔ فرانسس ۱۵۴۲ء میں گوا اترا اور ساڑھے چار برس کے عرصہ میں اس نے ساٹھ ہزار ملاحوں کو عیسائی بنایا۔ فرانسس کو برہمنوں سے بے حد نفرت تھی۔ وہ لکھتا ہے :-

"پجاریوں کی ایک قوم برہمن کہلاتی ہے۔ یہ قوم کبھی سچ نہیں بولتی۔ جھوٹ گڑھنے میں بہت ہوشیار ہوتی ہے۔ یہ برہمن سیدھے سادے عوام کو دھوکا دیتے ہیں۔ ان میں علم کی کمی ہے لیکن مکاریاں اس علم کا بدل ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ۔"

غریب الفانسو کو کیا معلوم تھا کہ ایک زمانہ آئے گا جب گوا پر ہندوستان قبضہ کرے گا اور اس وقت ہندوستان کی حکومت ایک برہمن کے ہاتھ میں ہوگی۔

فرانس نے اول اول گردہ کے گردہ کو عیسائی بنانے کا طریقہ اختیار کیا۔ اس نے لڑکوں کو ابھارا کہ اپنے گھروں میں بتوں کو چور چور کردیں اور پاؤں سے روند ڈالیں۔ اس نے مندروں کو توڑنے اور مٹانے کا حکم بھی دے دیا۔ اس نے لکھا ہے :

"وہی جو بتوں کی پوجا کرتے تھے، جب بتوں کو توڑتے تو مجھ کو بہت بھلا لگتا۔"

۱۵۵۹ء میں ایک قانون کے ذریعہ گوا میں ہندوؤں کے لئے سرکاری ملازمت کو ناجائز قرار دیا گیا۔ ان کی مذہبی کتابیں خلافِ قانون ہوگئیں۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ رامائن اور مہابھارت کے قصوں سے جنگ وجدل کی ہمت افزائی ہوتی ہے اور عیسائی مذہب میں معمولی بدلہ لینے کی بھی ممانعت ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ عیسائی قومیں باہمی جنگ وجدل میں سب سے آگے نکل گئیں۔ اور دونوں عالمی جنگوں میں بالخصوص دوسری جنگ عظیم میں تو قتل وغارتگری کی ایسی مثالیں پیش کیں جن کا تصور

انسان نے کبھی پیش نہیں کیا تھا۔

سترہویں صدی عیسوی میں نوبلی کی قیادت میں تبلیغی مشن گوا سے باہر مدورا پہنچا۔ نوبلی نے تامل، تلگو اور سنسکرت وغیرہ زبانیں سیکھیں اور چالیس برس تک عیسائی مذہب کی تبلیغ کی۔ جو عیسائی ہوتے ان کو اجازت ہوتی کہ وہ سر پر چوٹی رکھیں اور جنیو پہنیں۔ جو ہندوؤں کے مذہبی رجحانات ہیں اس رعایت سے ایک لاکھ برہمن عیسائی ہو گئے۔ نوبلی ۸۱ برس کی عمر میں مرگیا۔

۱۷۰۰ء میں پانڈیچری اور کلکتہ میں تبلیغی ادارے قائم ہوئے۔ ۱۷۱۲ء میں تبت میں بھی تبلیغی ادارے کا قیام عمل میں آیا۔ اس طرح پورے ہندوستان میں عیسائی مشن کا جال پھیل گیا لیکن اب تک یہ سارے ادارے رومن کیتھولک کے تھے۔

۱۷۰۶ء میں پہلے پہل پروٹسٹنٹ فرقہ کے رہنماؤں نے بھی قدم رکھا اور اس کے بعد پورے سو برس تک تمام یورپ سے مشن آتے رہے۔ ۱۸۵۹ء میں الیگزنڈر ڈف پروٹسٹنٹ پادری نے کارنمایاں انجام دیا اور برطانوی سلطنت کے استحکام میں مدد دی اور اس کے تبلیغی نظام کو ہندوستان میں ہر جگہ قائم کرایا۔ عیسائی مشن آدی باسیوں (جنگلی اقوام) میں، ہریجنوں میں، قبایلیوں میں اور پسماندہ اقوام میں کام کرتے ہیں۔ مجموعاً سات کروڑ پچاس لاکھ اسی ہزار ہیں۔ عیسائی مشن معاشی مذہبی، طبی، اخلاقی اور سیاسی میدانوں میں سرگرم ہیں۔

معاشی میدان میں یہ زرعی نوآبادیاں قائم کرتے ہیں، کوآپریٹو سوسائٹیاں بناتے ہیں۔ بیج اور زراعت کے بینک کھولتے ہیں۔ ایسے ادارے بناتے ہیں جہاں سے کسانوں کو قرض مل سکے۔ ان کے علاوہ میلوں، کھیلوں اور جانوروں کی نمائش وغیرہ کا بھی نظم کرتے ہیں۔

تعلیمی میدان میں ایسے مکتب ہیں کہ جن کی پڑھائی درختوں کے سایہ میں ہوتی ہے، عالیشان کالج، فن تعلیم کے ادارے، صنعتی اسکول اور فن تبلیغ کے منتظم بالشان مدارس شامل ہیں جن میں تین برس کے بچوں سے لے کر تیس برس کے

نوجوان طلبہ تعلیم پاتے ہیں۔

طبی میدان میں مختلف درجوں کے اسپتال آتے ہیں بالخصوص زچہ خانے ان کے علاوہ کوڑھیوں کے گھر اور ٹی بی سنٹر ہیں۔

مذہبی میدان میں انجیل کی اور دوسری مقدس کتابوں کی اشاعت بالخصوص دینا کاروں کی تربیت گاہیں، مصور پوسٹ کارڈ کی مفت تقسیم اور اعلیٰ مذہبی تعلیم کے کالج قائم ہیں۔

اخلاقی میدان میں یتیم خانے، بیواؤں کے گھر، طلبہ کے ہاسٹل اور جو عیسائی ہو جائیں ان کے اقامت خانے ہیں۔

سیاسی میدان میں ان کی کوئی مستقل سرگرمی نہیں ہے۔ وہ اپنے مفاد کو دیکھتے ہوئے مناسب اقدامات کرتے ہیں۔

ہندوستان میں عیسائی مشن کی امداد کے لئے مختلف عیسائی ملکوں سے جو رقم آتی ہے ان کی مجموعی تعداد ۲۹ کروڑ ۲۰ لاکھ ۳۹ ہزار روپئے ہیں۔ سب سے بڑی رقم امریکہ سے آتی ہے۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کو عیسائی بنانے کے لئے امریکہ سب سے زیادہ خرچ کرتا ہے۔ اس غرض سے اس کا سرمایہ مسلمان ملکوں میں لگا ہوا ہے۔ عموماً ۸۰۰ مشن ہندوستان میں کام کرتے ہیں۔ چودہ حلقہ واری کانسل ہیں جو ان مشنوں کی نگرانی کرتی ہیں۔ ان کانسلوں کے حسب ذیل حلقے ہیں:

آندھرا پردیش، آسام، اتر پردیش، آٹکل، بنگال، بہار، بمبئی، وسط ہند، حیدرآباد، کرناٹک، کیرالا، سنتھال پرگنہ، شمالی مغربی ہند، تامل ناڈو۔

جو غیر ملکی ہندوستانی مشن میں کام کرتے ہیں ان کا تناسب یہ ہے:

امریکہ	۵۱ فیصدی	فرانس	۱۲ فیصدی
برطانیہ	۱۰ "	سوئیڈن	۶ "
ہالینڈ	۶ "	جرمنی	۳ "
سوئٹزرلینڈ	۳ "	بلجیم	۳ "

دوسرے ممالک ۶ فیصدی

ان کے علاوہ خود ہندوستانی مبلغین ہیں جن کی تعداد ہزاروں ہے۔

مشن اسکولوں میں انجیل کی تعلیم اور عبادت میں شرکت لازمی ہے۔ اسپتالوں میں بھی عبادت کا اہتمام ہوتا ہے اور بھجن گائے جاتے ہیں۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے محاسن بتائے جاتے ہیں۔ مرعوب کن طرز زندگی بھی معاون تبلیغ ہوتی ہے. گاہے گاہے دوسرے مذاہب کی تنقیص بھی ہوتی ہے۔ گاندھی جی نے اپنے حالات زندگی میں لکھا ہے کہ وہ ایک دفعہ بازار میں کسی پادری صاحب کی تقریر سن رہے تھے، ہندو مذہب کی تنقیص انہیں پسند نہیں آئی اور وہ دوسری دفعہ تیار نہیں ہوئے کہ پادری صاحب کی تقریر سنیں۔ عیسائی مبلغین عیسائیوں کی بیکاری دور کرنے اور ان کو کام پر لگانے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔

عیسائی مبلغین یہ بھی بتلاتے ہیں کہ صرف عیسائی مذہب کے ذریعہ نجات ممکن ہے۔ ان کا یہ خیال دوسرے مذہب والوں کے نزدیک صحیح نہیں ہے۔ سب اپنے اپنے مذہب کو ہی نجات کا واحد ذریعہ سمجھتے ہیں۔ یہ فیصلہ کہ کس کا دعویٰ صحیح ہے، مذاہب کے تقابلی مطالعہ کے ذریعہ ممکن ہے بشرطیکہ مطالعہ بے لاگ اور تعصب سے خالی ہو۔ امتداد زمانہ سے اکثر مذاہب میں کافی تبدیلیاں ہو گئی ہیں اور ان پر سچائی کا اطلاق بہت مشکل ہے۔ اور اس خیال کو مان لینے سے کہ ہر مذہب اپنی جگہ سچا ہے۔ فرقہ بندیاں پیدا ہوں گی اور انسانیت کو سخت دھکہ لگے گا۔

عیسائی مذہب میں دشواری یہی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی کوئی ایسی مستند سوانح عمری موجود نہیں ہے جس سے زندگی کے ہر موڑ پر رہنمائی مل سکے اور نہ کوئی ایسی کتاب ہے جس کی صحت پر ہم پورا پورا بھروسہ کر سکیں۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کی تصدیق کی ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ وہ کوئی نیا دین نہیں پیش کر رہے ہیں بلکہ یہ وہی دین ہے جس کو سب نبیوں نے جو ان سے پہلے آئے پیش کیا۔ وہ سب نبیوں اور سب الہامی

کتابوں کو مانتے ہیں البتہ یہ کہتے ہیں کہ امتداد زمانہ سے اور مذہبی رہنماؤں کی غلطیوں سے آسمانی کتابوں میں، جو پہلے اتری ہیں، تحریف ہو چکی ہے۔ اس لئے سب اسلام کو ہی قبول کریں۔ یہی وہ مذہب ہے جو پہلے نبیوں کا تھا اور جس کی انہوں نے تبلیغ کی تھی۔ اس مذہب پر کسی خاص فرقہ کا اجارہ نہیں ہے۔

اگر یہ دعوت شرفِ قبولیت پا سکے تو انسان متحد ہو سکتا ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مستند اور مفصل سوانح عمری بھی موجود ہے جو شمع ہدایت کا کام کر سکتی ہے۔

بہر حال اس کی ذمہ داری ان پر ہے جو اسلام کو مانتے ہیں کہ وہ سبھوں تک اسلام پہنچائیں اور سبھوں کو اسلام پر جمع کریں۔

نوٹ:۔ یہ مضمون آج ۱۹۸۶ سے بیس سال پہلے کا لکھا ہوا ہے اس لئے اعداد و شمار بھی اسی وقت کے ہیں۔

اخلاقی بلندی کی ضرورت

ملک میں اس وقت جو برائی ہے اس کی بنیاد لالچ ہے۔ لالچ ہی نے ذخیرہ اندوزی سکھائی، حد سے زیادہ نفع خوری سکھائی، رشوتوں کا بازار گرم کیا۔ چوری —— وقت کی چوری، کام کی چوری، مال کی چوری، سب طرح کی خیانتیں اسی لالچ کا نتیجہ ہیں۔ قانون بنتے ہیں لیکن سورج کی تیز روشنی میں ان کی خلاف ورزیاں ہوتی ہیں۔ حکومت کچھ نہیں کر سکتی۔ اس لئے نہیں کر سکتی کہ حکومت کے کارندوں میں اخلاقی ابتری موجود ہے۔ ہم عدالتیں قائم کرتے ہیں، قید خانے بناتے ہیں، عدالتوں میں یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ فلاں شخص چور ہے لیکن کتنے تو رشوتوں کی بنا پر اور وکیلوں کی کوشش سے پہلے ہی چھوٹ جاتے ہیں۔ جن کے خلاف فیصلہ ہوتا ہے وہ قید خانوں میں جاتے ہیں قید خانے جرائم کی تربیت کے اڈے ہیں جو مجرم قید خانوں میں جاتا ہے وہ زیادہ بڑا مجرم بن کر قید خانہ سے باہر نکلتا ہے۔

ہمارے اسکولوں میں بچے پڑھتے ہیں، ان بچوں کو انگریزی، اردو، ہندی اور دیگر مضامین پڑھاتے ہیں، کھیلنے کا شوق بھی ان میں پیدا کیا جاتا ہے، کھیل کا سامان بھی دیا جاتا ہے۔ سماجی مطالعہ، حیوانات، نباتات، معدنیات، تاریخ، جغرافیہ، حساب، سب کچھ پڑھایا جاتا ہے لیکن اچھے اخلاق، نیک عملی، اچھائی اور برائی میں تمیز نہیں سکھائی جاتی۔ جس دیش میں اخلاق اور سیرت کی اہمیت نہیں وہ دیش تو بگڑیگا۔

ملک میں طلباء کے ہنگامے ہوتے ہیں بعض ہنگامے ایسے ہوتے ہیں کہ ہر محب وطن شرمندہ ہو جاتا ہے۔ اچاریہ کرپلانی نے ایک بار لڑکوں کی بے راہ روی پر ماتم کرتے ہوئے لکھا تھا کہ یہ لڑکے لباس کے معاملہ میں تو یورپ کی نقل کرتے ہیں لیکن یہ نہیں دیکھتے کہ وہاں

عورتوں کو سربازار چھیڑا نہیں جاتا بلکہ ان کا احترام کیا جاتا ہے۔

اساتذہ بھی کچھ کم قابلِ الزام نہیں ہیں۔ انہیں نئی نسل کو بہتر بنانے کی کوئی فکر نہیں ہے، انہیں فرض ادا کرنے کا کوئی احساس نہیں ہے۔ وہ یا تو کلاس میں نہیں آتے اور اگر آتے ہیں تو اپنے اسباق کا مطالعہ کر کے اور تیاری کر کے نہیں آتے۔ عام طور پر زیادہ سے زیادہ ٹیوشن کرنے اور روپئے کمانے کی حرص میں مبتلا رہتے ہیں۔ اگر ایک استاد کی زندگی اپنے شاگردوں کے سامنے محنت و شرافت، سادگی اور قناعت، علم کی طلب اور بلند اخلاقیات کا نمونہ نہیں بنے گی تو طالب علم کے اندر یہ جواہر کہاں سے آئیں گے؟ ان کی شخصیت کیسے نکھرے گی؟ ان کی سطح عام سطح سے بلند کیسے ہوگی۔

اساتذہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ طالب علموں کے سامنے اخلاقی بلندی کا نمونہ پیش کریں۔ اس میدان میں مسلمان اساتذہ کو حسنِ کردار کا نمونہ پیش کرنا چاہئے۔ اور حسن کردار پیدا ہوتا ہے آخرت کے یقین سے، خدا کے سامنے جوابدہی کے تصور سے، خدا کی مخلوق کو کے ساتھ محبت اور خدمت کو زندگی کا نصب العین بنانے سے۔ اخلاقی بلندی کی یہی اصل بنیاد ہے۔ بنیاد اگر مضبوط نہ ہوگی تو اخلاقیات کی عمارت تیار نہیں ہو سکے گی۔ اور اس بنیاد سے محروم انسان، دولت پرستی اور عیش کوشی اور معیار زندگی کی ریس میں مبتلا ہونے سے بچ نہیں سکے گا۔

کبر و نخوت دور کیجئے

مولانا حسین احمد مدنی رح نے اپنے ایک مکتوب میں لکھا ہے کہ:

"غیر مسلموں سے نفرت کر کے ہم ان کو دین سے قریب نہیں کر سکتے اور نہ ہم کسی قوم کے حسن و قبح کو جانچ اور پرکھ سکتے ہیں

حقیقت یہ ہے کہ یہ نصیحت بڑی کار آمد اور مفید ہے۔ بد قسمتی سے ہم نے ہندوستان میں تبلیغ دین کا کام کم کیا ہے۔ دین کو تعصب، نفرت اور کبر و غرور کا ذریعہ زیادہ بنایا ہے۔ ان عیوب نے ہم کو دوسری قوموں سے دور اور نفور کر دیا ہے۔ دوری کی وجہ سے اسلام کے متعلق غلط فہمیاں پیدا ہوئی ہیں اور ہم ان غلط فہمیوں کو مٹا نہیں سکے ہیں۔ یہ ایسی صورتحال ہے کہ مسلم اکابر اور علماء کو اولین فرصت میں اس پر غور کرنا چاہئے اور ایسی فضا بنانی چاہئے کہ مسلمان اپنے دین پر قائم بھی رہیں اور دوسری قوموں سے اس قدر قریب ہو جائیں کہ اسلام کی خوشبو ان تک پہنچے۔ اگر وہ مسلمان نہ بھی ہوں تو اسلام کے قدر داں ضرور ہو جائیں۔ دوسری طرف مسلمان بھی غیروں کی اچھی باتیں اپنائیں جیسا کہ حضور صلعم نے فرمایا ہے کہ ہر اچھی بات مسلمانوں کی کھوئی ہوئی میراث ہے اور مسلمان اس کا زیادہ حقدار ہے۔ آپ نے مزید یہ فرمایا کہ جو اچھی باتیں ہوں انہیں لے لو اور جو بری باتیں ہوں انہیں چھوڑ دو لیکن اس تعلیم پر اسی وقت عمل ہو سکتا ہے جب ہمارا ذہن تعصب و تنگ نظری اور کبر و غرور سے خالی ہو۔ لیکن ہمارا حال یہ ہے کہ ہم تو آپس میں تعصب برتتے ہیں، غیر مسلموں کے خلاف تعصب سے کیسے بچ سکتے ہیں

ضرورت ہے کہ ہم اپنی اچھی باتیں دوسروں کو دیں اور دوسروں کی اچھی باتیں لیں۔ ہم اپنی بری عادتوں کو چھوڑ دیں اور دوسروں کو بری باتوں سے بچائیں، یہانتک کہ نیکی غالب ہو۔ دین درحقیقت معروف طریقہ پر عمل کرنے کا اور منکر سے بچنے کا نام ہے اور ساتھ ہی عقائد کی درستگی اور صحت کا بھی۔ یہ دین اس لئے نہیں ہے کہ ہم اٹھتے بیٹھتے فخر و غرور کی باتیں کریں اور دنیا کی کوئی برائی نہ چھوڑیں۔ اگر برائیوں پر متنبہ کیا جائے تو ناراض ہو جائیں۔ کسی نے مولانا محمد علی جوہر سے کہا تھا کہ "آپ کو ہندو اچھے لگتے ہیں، ان سے ملتے ہیں اور مسلمانوں کو برا کہتے ہیں۔" مولانا نے فوراً جواب دیا کہ گھوڑ دوڑ میں سوار اپنے گھوڑے کو ہی چابک لگاتا ہے۔ دوسرے کے گھوڑے کو نہیں۔"
آج مسلمانوں کو ایسی قیادت کی ضرورت ہے جو دوسروں سے زیادہ خود مسلمانوں پر

تنقید کرے اور ان کی کوتاہ عملی پر سرزنش کرے۔ لیکن مسلمان ایسی قیادت کو تسلیم نہیں کریں گے۔ انہیں ایسی قیادت پسند ہے جو انہیں قومی فخر کے نشہ میں چور کر دے۔ مسلمانوں کو یہ سمجھنا چھوڑ دینا چاہیئے کہ وہی سب سے اچھے ہیں۔ جیسے سب ہیں وہ بھی ہیں۔ انہیں سب سے اچھا ہونا چاہیئے تھا تاکہ دوسروں کو اچھا بنا سکیں لیکن تعصب، تنگ نظری، نفرت، کبر و غرور یہ سب عیب کی باتیں ہیں اور اسلام ان کی اجازت نہیں دیتا ہے۔ اسلام نے استغفار کا حکم دیا ہے، استکبار کا نہیں۔ ہر روز جب نیا دن طلوع ہو تو مسلمان کو بندگی کا نیا عہد کرنا چاہیئے۔ نماز فجر دراصل ایک عہد ہے۔

آیئے ہم عہد کریں کہ اللہ کے فرمانبردار رہیں گے، عجز و انکسار کو اپنا طریقہ بنائیں گے غلطیاں کریں تو اس پر نادم ہوں گے، اپنا احتساب کریں گے۔ اللہ کی مخلوق سے محبت کریں گے اور خدا کا آخری پیغام خدا کی مخلوق تک پہنچائیں گے۔ کوئی ایسا کام نہیں کریں گے جس سے نفرت اور دشمنی کی خلیج پیدا ہو اور ہمارا پیغام خدا کے بندوں تک نہ پہنچ سکے۔

ایک اسوہ سادگی کا

مولانا سید حسین احمد مدنی رح نے ایک اجلاس میں جمعیۃ العلماء کے خطبہ صدارت میں لکھا ہے کہ:

"شیخ علی متقی کا واقعہ مشہور ہے کہ ان کو ایک مسلمان بادشاہ کے وزیر باتدبیر نے دعوت کے لئے اصرار کیا۔ جب اصرار حد سے زیادہ بڑھا تو آپ نے دعوت منظور کر لی لیکن اس شرط پر کہ جہاں چاہوں گا بیٹھوں گا، جو چاہوں گا کھاؤں گا اور جب چاہوں گا اٹھ کر چلا آؤں گا

وزیر کا شوق اتنا بڑھا ہوا تھا کہ اس نے اس منظوری کو غنیمت جانا
اور شرائط کے مضمرات کی طرف وہ توجہ بھی نہ دے سکا۔ چنانچہ حضرت
شیخ تشریف لے گئے تو شاہانہ قالینوں اور غالیچوں کو چھوڑ کر دروازہ کے
قریب زمین پر بیٹھ گئے۔ کھانا چنا گیا تو اپنے تھیلے میں سے روٹی نکال
کر کھائی اور السلام علیکم کہہ کر واپس تشریف لے آئے۔"

یہ واقعہ اس لئے نقل کیا گیا ہے کہ جو مسلمان تبلیغ و اصلاح کا ذوق رکھتے ہیں،
وہ اس سے سبق لیں۔ انہیں بھی حکومت اور اہل حکومت کی قربت اور دربار داری
سے بے نیاز رہنا چاہئے۔ انہیں بھی دنیوی عیش و آرام، مال و دولت اور کر و فر سے
بے پرواہ ہونا چاہئے۔ جہاں پر شاہانہ کر و فر ہو وہاں بھی ایک داعی کی سادگی کا مظاہرہ
کرنا چاہئے۔ ہم ایسا محسوس کرتے ہیں کہ ہمارے بعض اہل دین جو اہل دنیا کی طرح
تبلیغ و اصلاح کی راہ میں نکلتے ہیں۔ ان کا نفس اعزاز ڈھونڈتا ہے اور وہ اہل دنیا کی
طرح رؤسا اور حکام سے قریب رہنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ عوام
ان کی تعظیم میں کوئی کوتاہی نہ کریں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر ایسا نہ ہو گا تو وہ اپنے مشن میں
کامیاب نہ ہوں گے۔ حالانکہ اس طرح کی فکر اپنے مقصد میں یکسو نہیں رہنے دیتی اور
جس طرح کا مزاج اسلام بنانا چاہتا ہے اس کا نمونہ پیش کرنے سے وہ قاصر رہتے ہیں۔
تعجب یہ ہے کہ غیر مسلموں میں آج بھی ہمیں ایسے اشخاص مل جاتے ہیں جو بادشاہ
کے دربار میں لنگوٹی اور دھوتی باندھ کر جاتے ہیں، جنہوں نے گورنر جنرل کے یہاں
پہنچ کر اپنا معمولی کھانا کھایا، جنہیں سفر کے لئے اول درجہ کا ریل کا ڈبہ پیش کیا گیا
لیکن وہ تیسرے درجہ کے ڈبہ میں اصرار کے ساتھ بیٹھے لیکن ہمارے علماء، صوفیا
واعظین، مبلغین کی زندگی اس نمونہ سے خالی ہے جو صحابہ کرام نے نجاشی کے
دربار میں پیش کیا تھا۔ آج کے علماء و صلحاء جدید تمدن کے پر تکلف سامانوں سے
مرعوب ہو جاتے ہیں اور آسانی سے احساس کمتری کا شکار ہو جاتے ہیں۔ رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور صلحائے امت کی سادگی، بے تکلفانہ زندگی

کو مقبول بنانے اور اس کا نمونہ پیش کرنے کی ان میں ہمت نہیں ہوتی۔

اسلام کو قبول کرنے میں پہل غریب طبقہ نے کی ہے اور غریب طبقہ ہی پہل کرسکتا ہے۔ اس طبقہ میں اسلام پہنچانے کے لئے ہمیں رہن سہن میں غریبوں کا ہی انداز اختیار کرنا چاہئے۔ معیارِ زندگی کو بلند کرنے سے عام لوگ داعی سے دور ہی ہوں گے، قریب نہیں ہوں گے۔

ٹوٹی پھوٹی جھونپڑیوں میں رہتے والوں کو دیکھئے، وہ کس طرح رہتے ہیں، ان کو اپنے سے مانوس کرنا ہے تو اپنے کو ان سے بلند کرکے نہ پیش کیجئے۔ اگر اونچے طبقہ کے لوگ آپ سے ملنا چاہتے ہیں تو بہت اچھی بات ہے لیکن ان سے کہدیجئے کہ ہم فقیری کو پسند کرتے ہیں۔ معیار زندگی کی بلندی کے نہ تو قائل ہیں اور نہ ہی اس فلسفہ پر عامل ہیں۔

معیار زندگی اس دور کا صنم اکبر ہے۔ ہر مذہب کے لوگ اس صنم اکبر کی پرستش کر رہے ہیں۔ ایک داعی دین بھی اگر اس کی پرستش میں مبتلا ہو جائے گا تو اپنی تاثیر شخصیت کی تاثیر کھودے گا۔ ایک متوسط درجہ کی زندگی کے معیار سے کم ہی درجے کا معیار اس کے لئے ضروری ہے۔ سب سے پہلے اسے اس بات کا نمونہ پیش کرنا ہے کہ دنیاوی عروج و اقتدار اور شان و شوکت سے اس کی آنکھیں خیرہ نہیں ہوتیں مادی تہذیب کی خوش جمالیاں اور عارضی چمک دمک اس کے نزدیک کوئی وقعت نہیں رکھتیں۔ "الدنیا یومٌ ولنا فیہا صومٌ" پر اس کا عقیدہ ہے اور یہی اس کی زندگی کا شعار ہے۔

خلافت الٰہی

اللہ تعالیٰ نے زمین پر انسان کو اپنا نائب اور خلیفہ بنایا ہے اور زمین و

آسمان کی سب چیزیں اس کے لئے مسخر کردی گئی ہیں۔ نوع انسان میں خلافت و نیابت الٰہیہ کی ادائیگی کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ کے ان فرمانبردار بندوں کو تفویض ہوئی ہے جو تسخیر قلب کی صلاحیت زیادہ سے زیادہ اپنے اندر پیدا کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے تعلق بھی جوڑے ہوئے ہیں۔ اس تسخیر و تالیف کے لئے عام ہمدردی اور خدمت کی تعلیم ہے۔ مال سے بھی اور جان سے بھی۔ مال کے ذریعہ ہمدردی اور خدمت غربا و مساکین یتامیٰ و بیوگان اور دیگر محتاجوں کی امداد ہے۔ مال کا خرچ عبادت میں داخل ہے۔ اس عبادت کا اجر اللہ تعالیٰ کے یہاں ہے۔ صدقات کی ایک قسم زکوٰۃ ہے جسے اسلام نے فرض کیا ہے۔ صدقات کی باقی قسموں کے لئے بھی بڑی فضیلتیں ہیں اور بڑا ثواب ہے۔ تحائف و عطایا کی بھی ہمت افزائی کی گئی ہے۔ جان کے ذریعہ ہمدردی اور خدمت میں تیمارداری اور عیادت، مظلوم کی حمایت، راستہ سے کانٹا ہٹانا، اندھے کو راستہ بتانا، لنگڑے کو گھر پہنچانا، بے علم کو علم دینا وغیرہ یہ سب امور آتے ہیں۔ پھر غصہ نہ کرنا، مجرم کو معاف کر دینا، خود نقصان اٹھا کر دوسروں کو فائدہ پہنچانا، اعلیٰ اخلاقی اوصاف ہیں۔ خود غرضی سے بچنا اور اپنی خواہش کو دبانا، اپنی زبان کی حفاظت کرنا، غیبت سے، فحش گوئی سے، سخت کلامی سے پرہیز کرنا تسخیر قلب کے لئے ضروری ہے۔ چھری کا زخم بھر جاتا ہے لیکن زبان کا زخم نہیں بھرتا۔ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم دو چیزوں کی ضمانت دے دو میں جنت کی ضمانت دیتا ہوں۔ ایک اس چیز کی جو تمہارے دو جبڑوں کے درمیان ہے دوسرے اس چیز کی جو تمہارے ران کے درمیان ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ شہوانی خواہشات اور زبان کی بے لگامی انسان کو جہنم میں لے جاتی ہے اور دنیا کو بھی جہنم بنا دیتی ہیں۔ تسخیر و تالیف کیلئے اکرام آدم کی اہمیت بھی ہے۔ یہ بھی رسول کی ہی تعلیم ہے، یہ انسان کا دوسرے انسان پر حق ہے کہ وہ ایک دوسرے کی عزت کرے۔ اور ایک دوسرے کی ضرورت میں کام آئے۔ اگر وہ انسان مسلمان ہے تو یہ حق اور مؤکد ہو جاتا ہے۔ اکرام مسلم کی بڑی تاکید ہے۔ ایک دوسرے کو ذلیل کرنے اور

نقصان پہنچانے کے خلاف سخت وعید ہے اور بے قصور انسانوں کو قتل کرنے کی سزا تو جہنم ہی ہے۔ غیبت کی ممانعت کے پیچھے بھی یہی جذبہ کام کر رہا ہے۔ کسی کو بدگمان نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ اس صورت میں اس کے دل سے ہمدردی کرنے کا جذبہ ختم ہو جائیگا۔ تسخیر و تالیف کی سعی و جہد میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرنا چاہیئے اور ہرگز ایسا کام نہیں کرنا چاہیئے جو وجہ عناد ہو جائے۔ جب غیبت کی مذمت ہے تو بہتان باندھنا سخت تر گناہ ہے اور خود اس دنیا میں سخت نقصان کا سبب ہے دھوکہ دینا، جھوٹ بولنا، تسخیر و تالیف کے لئے سم قاتل ہیں۔ ان سے اعتماد اور بھروسہ جاتا رہتا ہے۔

اس لئے اگر ہم چاہتے ہیں کہ امامت و پیشوائی کا مقام ہمیں حاصل ہو اور تمکین فی الارض کے انعام و اکرام سے ہم نوازے جائیں تو ہمیں تسخیر و تالیف کی پوری کوشش کرنی چاہیئے اور ان تمام اخلاقی اسلحوں سے مسلح ہونا چاہیئے کہ جن کی تعلیم ہم کو کتاب و سنت سے ملتی ہے۔ اس معاملہ میں بہت بیدار و ہوشیار رہنا چاہیئے کہ کہیں کوئی معمولی لغزش تسخیر و تالیف کے مقصد میں ہم کو ناکام نہ بنا دے۔ دشمن کو راضی اور خوش کرنے کا اہتمام کرنا چاہیئے اور اس کے لئے اللہ سے توفیق بھی مانگنی چاہیئے۔ اس کی رضا کی کوشش بھی کرنی چاہیئے کیونکہ بغیر اللہ کی مرضی کے ایک تنکا بھی اپنی جگہ سے نہیں ہل سکتا۔ خدا نفع پہنچانا چاہے تو کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتا اور ضرر پہنچانا چاہے تو کوئی نفع نہیں پہنچا سکتا۔ خدا کے غضب سے بہت ڈرنا چاہیئے اور اس کے عذاب سے پناہ مانگنی چاہیئے۔ قرآن میں حکم ہے "وایای فارھبون" یعنی تم صرف مجھ ہی سے ڈرو۔

تسخیر و تالیف کی کوشش اللہ کو ناراض کر کے اور اس کے حکم کی خلاف ورزی کر کے نہیں کرنی چاہیئے۔ ہر حال میں حدود اللہ کا پاس و لحاظ رکھنا چاہیئے۔ اگر اللہ کو راضی کرنے میں ساری دنیا ناراض ہو تو پرواہ نہیں۔ وہ اگر راضی ہو تو ساری دنیا ہماری ہو جائے گی۔ ہاں اس کو راضی کر کے اور اس کی رضا کے لئے دوسروں کو راضی کرنے

کی کوشش کرنی چاہیئے۔

یہاں سوال یہ ہے کہ ہمارے اندر خلافت الٰہی کے اوصاف کیسے پیدا ہوں خدا کی اہمیت دل میں کیسے اترے، خدا کی باتوں کو پھیلانے کا عزم کیسے پیدا ہو اور اس راہ میں سختیاں جھیلنے کا حوصلہ کیسے آئے؟

ان اوصاف کے لئے مسلسل "اپنی تربیت آپ" کے نظام کی ضرورت ہے۔ مندرجہ ذیل تربیتی نظام کی بنیادوں کی پابندی کرنے سے یہ اوصاف پیدا ہوسکتے ہیں:۔

(۱)۔ خدا کی خشیت، رہبت اور اس کی محبت دل میں بٹھانے کے لئے روزانہ گریہ وزاری کے ساتھ دعا۔ مسنون اذکار میں سے کچھ اذکار کی پابندی۔

(۲)۔ فرض نمازوں کے ساتھ نوافل کا اہتمام۔ غفلت کے ساتھ نمازوں کی ادائیگی کے بجائے پورے شعور اور تدبر کے ساتھ اور دل کے حضور کے ساتھ نمازوں کی ادائیگی۔

(۳)۔ روزانہ قرآن کا کچھ حصہ اس کے معانی پر غور و فکر کے ساتھ اور اسے خدا کی طرف سے کتابِ ہدایت سمجھ کر پڑھنا۔ معانی پر غور و فکر کے ساتھ کلام الٰہی کے ساتھ ادب کے تقاضوں کو بھی ملحوظ رکھنا۔

(۴)۔ روزانہ وقت کا کچھ حصہ حدیث یا سیرت یا صحابۂ کرام کے حالات زندگی یا صلحاء و اولیاء کے حالاتِ زندگی کا مطالعہ کرنا۔

(۵)۔ اہل دین سے حتی الامکان تعلق اور خالص دنیاداروں کی صحبت سے اجتناب۔

(۶)۔ روزانہ "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" پر کسی قدر عمل کی کوشش

(۷)۔ ہر روز سونے سے پہلے خاموشی کے ساتھ دل میں اپنا احتساب، اپنی غلطیوں پر ندامت اور استغفار اور نیک عملی کی توفیق پر خدا کا شکر۔

کچھ لمحے ایک داعی دین کے ساتھ

ایک روز ایڈیٹر نقیب راقم السطور اپنے دفتر میں بیٹھا تھا۔ دیکھتا ہے کہ ایک پاؤں کا آدمی لکڑیوں کے سہارے چلا آرہا ہے۔ دل اس کی طرف کھنچا۔ وہ نہ جانے اس سے پہلے ہند اور بیرون ہند میں کتنوں کو اپنی طرف کھینچ چکا تھا۔ ایڈیٹر نقیب آگے بڑھا۔ سلام کے ساتھ مصافحہ کیا۔ وہ غریب ان ہی لکڑیوں کے سہارے کمرے تک آیا، بیٹھا، اپنا تعارف کرایا کہ وہ افتخار فریدی ہیں۔ تبلیغی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں۔ پھر قاضی احمد حسین مرحوم کے حالات دریافت کئے۔ امارت پر کتابیں دیکھنے کی خواہش کی۔ مولانا سجادؒ کی تعریف میں اس شعر کو پڑھا

پھونک کر اپنے آشیانے کو
روشنی بخش دی زمانے کو

بولے کیا خوب شعر ہے۔ پھر کاغذ کے ایک ٹکڑے پر لکھ کر اپنے پاس رکھ لیا۔ پھر اجتماع کی دعوت دی۔ انکار کی کیا مجال تھی۔ ایک پاؤں سے محروم ملکوں ملکوں کی خاک چھانتا پھرتا ہے تاکہ انسان کو انسانیت سکھائے۔ ایک ہم کہ اللہ کی نعمت دونوں پاؤں موجود، لیکن اللہ کی راہ میں چلنے کی ہمت نہیں۔ عرض کیا کام کا نہیں ہوں لیکن حاضر ہو جاؤں گا۔ چنانچہ جلسہ سے کچھ پہلے دفتر کے سبھی لوگ پہنچ گئے۔ صرف ایک صاحب بیت المال میں اور دو صاحب دارالقضا میں رہ گئے۔

فریدی صاحب کے ساتھ کالجوں کے طلبہ سے ملنا ہوا۔ وہ طلبہ کو خطاب کر رہے تھے اور یہ راقم اپنی بدبختی پر رو رہا تھا۔ جو طلبہ بڑے بڑے شعلہ بیان مقرر سے متاثر نہ ہوئے وہ بھی گرویدہ ہو گئے۔ گرویدگی اس طرح دیکھی کہ وہ بار بار فریدی صاحب کے پاس حاضر ہوتے اور ایسے مسحور ہوتے کہ ان کی ہر بات کو مان لیتے۔

انہوں نے کہا کہ زمانہ اس بات کا تقاضہ کر رہا ہے کہ تم اللہ کے لئے نکلو یہ بات چل

پڑی ہے، تم کو نکلنا ہوگا۔ اب نکلو گے تو ایک بات رہے گی، جب سب نکل پڑیں گے اس وقت نکلو گے تو کیا خاص بات ہوگی۔ فریدی صاحب کی ساری گفتگو نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور اسلاف کی، دین کے لئے محنت کی مثالوں نے ایک جوش پیدا کر دیا۔ تھوڑے بے قدر انسانوں نے عزم کر لیا کہ وہ دنیا کو بدل دیں گے۔ انسان کو جو انسان نہیں رہا در ندہ ہو گیا ہے بدلیں گے۔ ایٹمی ہتھیاروں کی جگہ محبت کے ہتھیار، خدا پرستی کے ہتھیار استعمال کریں گے۔ سب کو دنیا پرستی سے ہٹا کر خدا کی چوکھٹ پہ جھکائیں گے۔ بہت ہوں گے جو ان غریبوں کو اور فریدی صاحب جیسے سادہ لوگوں کو حقیر نظروں سے دیکھ رہے ہوں گے۔ لیکن مشیت پکار کر کہہ رہی ہے ؎

خاکساران جہاں را بحقارت منگر
تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

حضرت موسیٰ کیسی بے سروسامانی میں پیدا ہوئے لیکن انہوں نے فرعون کا تختہ الٹ کر رکھ دیا تاجدار انبیاء یتیمی اور بے سروسامانی میں پروان چڑھے، اللہ نے ان کے ذریعہ ہدایت پھیلائی۔ الم یجدک یتیما فاوی ووجدک ضالا فھدی ووجدک عائلا فاغنی فاما الیتیم فلا تقھر واما السائل فلا تنھر واما بنعمۃ ربک فحدث۔

ہدایت کا آفتاب حکومت کے ایوانوں سے اور قصر ہائے دولت سے اپنی کرنیں نہیں پھینکتا، یہ آفتاب طلوع ہوتا ہے غربت کدوں سے، جھونپڑوں سے اور مٹی کے بنے ہوئے مکانوں سے۔

قابل احترام ہیں وہ لوگ جنہوں نے دولت کو اور زندگی کی آسائشوں کو مقصود زندگی نہیں بنایا۔ جتنے دن اس دنیا میں رہے، بلند مقصد حیات کو سامنے رکھ کر زندگی گذارتے رہے۔ مادی زندگی کی رونقوں پر ایک نگاہ غلط انداز ڈالنا بھی انہوں نے گوارہ نہیں کیا۔

خانوادہ مجیبی کا ایک نقش

ساٹھ برس سے زیادہ ہوئے، برطانوی اطالوی روسی (زار روس) فوجیں خلافت اسلامیہ ترکیہ کے تار تار بکھیرنے پر تلی ہوئی تھیں۔ امریکا بھی ان کی پشت پر تھا کیونکہ انگریزوں نے یہ وعدہ کر لیا تھا کہ فلسطین کو یہودیوں کا وطن بنا دیا جائے گا۔ مسلم ممالک کے حصے بخرے ہو رہے تھے۔ ہندوستان کے مسلمان اس صورتحال سے بے چین تھے۔ جدھر سے دیکھو، مسلمان بپھرا ہوا نظر آ رہا تھا۔ سوچتا تھا کہ وہ آزاد ہوتا تو بین الاقوامی سطح پر مسلمانوں کے لئے کچھ کرتا۔ خلافت اسلامیہ ترکیہ کی حفاظت میں جان کی بازی لگا دیتا لیکن افسوس کہ وہ ہندوستان کے بڑے قید خانے میں بند ہے یعنی برطانوی سنگینوں کے زیر سایہ زندگی بسر کر رہا ہے۔ ان میں کچھ ہوشمند تھے جنہوں نے سوچا کہ جان دینے کے لئے قسطنطنیہ اور سمرنا کے محاذ ہی کیوں، طرابلس کا میدان کارزار ہی کیوں، افریقہ کے تپتے ہوئے ریت پر ہی خون کا چھڑکاؤ کیوں ہو، آخر ہندوستان کی مقدس سرزمین بھی تو لالہ زار بن سکتی ہے۔ ارادے کی دیر تھی، نوجوان ہی نہیں، کتنے بوڑھے بھی سر سے کفن باندھ کر نکل پڑے شور تھا کہ ہم خلافت کے ٹکڑے نہیں ہونے دیں گے، جیتے جی ہم سے یہ غم نہیں سہا جائے گا۔ جدھر دیکھئے، جاگنے والے چراغ ہدایت بکف، دوسروں کو جگا رہے تھے۔ صوبہ سرحد سے لے کر آسام تک اور راس کماری سے لے کر ہمالیہ کی ترائی تک "کرو اور مرو" کا ہنگامہ گرم تھا۔ اس عہد کے لوگ کچھ نہ کچھ تو بچتے ہیں، ان سے پوچھئے۔ ان میں سے ہر ایک نے یہ صدا سنی تھی ؎

بولیں اماں محمد علی کی
جان بیٹا خلافت پہ دے دو

اسی صوبہ بہار کی بات ہے، حضرت مولانا شاہ محی الدینؒ جو بعد میں امیر شریعت بہار

ہوئے، سارے بہار کا دورہ کر رہے تھے اور انگریزی مالوں کے مقاطعہ کا پیغام گھر گھر پہنچا رہے تھے، افواہیں گرم تھیں کہ بس وہ گرفتار ہی ہو چلے۔ سنت یوسفی ان کے نصیب میں بھی ہے۔ لیکن ان افواہوں نے پائے ثبات میں لغزش بھی نہ آنے دی وہی جوش، وہی امنگ، وہی حوصلہ اور وہی دیوانگی۔ جو خدا سے ڈرتا ہے وہ کسی سے نہیں ڈرتا۔ وہ انگریزوں سے کیوں ڈرتا؟ وہ اپنی دھن میں تھے جو ہونا ہوگا، ہوگا۔ اللہ کے راستہ میں ہوگا۔ اللہ کی مرضی سے ہوگا۔ وہ ایسا سوچتے تھے ع

ہر کہ از دوست می آید نیکو است

ان اللہ اشتری من المومنین انفسھم واموالھم بان لھم الجنۃ (اللہ تعالیٰ نے مومنوں سے ان کی جان ومال جنت کے بدلہ خرید لی ہے)۔

یہ تو عین دانائی ہے کہ دنیا کی اس حقیر زندگی میں تکلیف اٹھالی جائے تاکہ جنت کی نعمتیں اللہ تعالیٰ کی رضا سے حاصل ہو سکیں۔

یہ تو شاہ محی الدینؒ کا حال تھا جو امیر شریعت ثانی ہوئے جنہوں نے جمعیۃ علمائے بہار، دار القضا بہار اور امارت شرعیہ کے قیام میں مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ کے ساتھ حصہ لیا۔ بوڑھے باپ نے کچھ کم جوش کا ثبوت نہیں دیا۔ نہ صرف یہ کہ اپنے صالح بیٹے کو اس کی اجازت دی کہ فراعنۂ وقت سے ٹکر لیں بلکہ خود بھی شمس العلماء کا خطاب واپس کیا اور مسلمانوں کی رہنمائی کے لئے آگے بڑھے۔ تمام سطحی مصلحت بینیوں سے بے نیاز ہو کر، نہ جان کا خوف نہ مال کا خوف نہ اسکا کہ سرکاری آؤ بھگت میں کمی واقع ہو جائے گی، سرکاری اعزازات اور انعامات کی حرص بھی راستہ میں حائل نہیں ہوئی۔

آج مسلمانوں کی جان، مال، دین، عزت سب خطرہ میں ہے۔ بے دین قیادت نے پاکستان کے بدلے ہندوستان کو اور ہندوستان کے مسلمانوں کو ہندوؤں کے حوالہ کر دیا ہے۔ ہندوؤں میں کچھ سمجھدار اور اچھے بھی ہیں، وہ ہندوستان کو ہندو حکومت بنانے پر راضی نہیں لیکن

فرقہ پرست قومیں چاہتی ہیں کہ ہندوستان خالص ہندو حکومت ہو جائے۔ ماشاءاللہ خانوادۂ مجیبی کے متوسلین بڑی تعداد میں ملک کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے ہیں، کیا ان کے لئے وقت نہیں آگیا ہے کہ پھولوں کے بستر چھوڑ کر کانٹوں سے الجھیں مصلحت پرستی کی راہ تو بہتوں نے اختیار کی ہے، کوئی ہے جو مجنونوں کی راہ اختیار کرے۔

سینۂ افلاک سے اٹھتی ہے آہِ سوز ناک
مردِ حق ہوتا ہے جب مرعوب سلطان و امیر

آج اس ملک میں ایسی قیادت کی ضرورت ہے جو مسلمانوں کے دلوں سے خوف اور احساس کمتری کو دور کر دے، جو خود تملق پسندی، چاپلوسی اور خوشامد سے دور رہے اور اقتدار وقت سے خوف نہ کھائے اور ہر حال میں صحیح بات کہے۔ دوسری طرف ہندو عوام کے درمیان اسلام کے تعارف کا کام انجام دے اور ان کے دلوں سے نفرت اور عداوت کے جذبہ کو کم کر دے۔

مرکز رحمانی سے ایک مکتوب

خانوادہ رحمانی کے ایک نوجوان کا مکتوب ایڈیٹر نقیب کے نام

"اس خط کے محرک آپ کے وہ اداریئے ہیں جو نقیب کے پچھلے دو شماروں میں آپ نے سپرد قلم کئے ہیں۔ تحریری ہو یا زبانی، منہ پر ستائش اور مدح سرائی کو حد درجہ مذموم سمجھتے ہوئے بھی دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر یہ عریضہ لکھنے بیٹھ گیا۔ کیا عرض کروں، آپ کے اداریو کو پڑھ کر مجھ پر کیا کیفیت طاری ہوئی ——— عثمانی صاحب! ممکن ہے آپ کو اس حق گوئی کی قیمت ادا کرنی پڑے مگر مجھے یقین ہے کہ بھاری سے بھاری نقصان اٹھا کر بھی آپ اپنے اصولوں سے

منحرف نہ ہوں گے ؎

آئین جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی "

یہ ستائش، یہ ہمت افزائی، یہ نصیحت اس کا پتہ دیتی ہیں کہ نوجوان حالات کا مقابلہ کس طرح کرنا چاہتے ہیں۔ مولانا محمد علی مونگیریؒ میں دین کے لئے، حق و صداقت کے لئے، ابطال باطل کے لئے، صالح انقلاب کے لئے جو جوش اللہ تعالیٰ کی طرف سے ودیعت ہوا تھا ان کی اولاد میں بھی اس کی گرمی محسوس کی جا سکتی ہے۔ حضرتؒ بہار کو قادیانیت سے بچانے کیلئے یوپی سے بہار تشریف لائے اور اس راستہ میں اپنی پوری قوت صرف کر دی۔ آج ان کا فیض ہے کہ جہاں تک اس فتنہ کا تعلق ہے، مسلمان پوری طرح بیدار ہیں۔ پھر آزادی ہند کی تحریک میں ان کی اولاد نے بے مثال قربانیاں پیش کیں، حکومت کے مشق ستم بھی بنے اور اپنوں کی گالیاں بھی سنیں لیکن آزادی پسندوں کا جو محاذ مسلمانوں کے ایک گروہ نے بنا لیا تھا اس کو قوت ہی پہنچاتے رہے۔ ان کے اہل خاندان قید و بند کی زندگی گذار چکے ہیں۔ اس راہ میں ان کے پاؤں میں آبلے پڑ چکے ہیں۔ ان حضرات کو تختۂ دار پیش نہ ہوا لیکن انہوں نے کبھی بھی اپنے کو تختۂ دار سے بچانے کی کوشش نہیں کی۔ ان کے سینے برطانوی گولیوں سے محفوظ رہے لیکن انہوں نے اپنی چھاتیوں کو گولیوں کے لئے ہمیشہ کشادہ رکھا۔ اگر اس خاندان کے ایک نوجوان نے ایڈیٹر نقیب کو اس طرح کا مکتوب بھیج دیا ہے تو یہ حیرت کی بات نہیں ہے۔ یہ بہت امید افزا ہے۔ اس سے اس یقین کی تصدیق ہوتی ہے کہ ہمارا مستقبل روشن ہے۔ اس خانوادہ سے اس کی تائید نہ ملتی تو یہ حیرت کی بات ہوتی۔ اس خانوادہ کے متوسلین اگر اس طرح نہیں سوچ رہے ہیں تو یہ حیرت کی بات ہے۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ اس پاور ہاؤس سے بجلی دور دراز منزلوں تک پہنچ جاتی جو خدام اور متوسلین میں نہیں ہیں ان کے قلوب بھی گرما جاتے لیکن اگر عام مسلمانوں کے قلوب متاثر نہیں تو کم از کم اتنا تو ہو کہ یہ مرکز آتش کدہ ایمان بن جائے

اور اس کی گرمی اور حرارت آس پاس کے ماحول کو گرم کردے۔ آخر یہ کیا ہے۔ جو لوگ مولانا مونگیری کا نام لیتے ہیں ان کے دل غیرت ایمانی سے لبریز نہیں۔

اعدار دین دین کو مٹانے پر تلے ہوئے ہیں۔ دشمنان ملت ملت کا تار تار علیحدہ کرنے پر مستعد ہیں۔ مسلمانوں کے جان و مال کی خیر بھی نہیں ہے اور ہم جو بہت کچھ مظلوموں اور بے کسوں کے لئے کر سکتے ہیں اپنی دنیا بنانے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں ؎

عقل انگشت بدنداں ہے اسے کیا کہئے

جی چاہتا ہے اقبال کی زبان میں سلطان ٹیپو کی وصیت ان تمام حضرات کی خدمت میں پیش کردی جائے جو علمار اور بزرگان دین کی مسندوں پر فائز اور متمکن ہیں۔

تو رہ نوردِ شوق ہے منزل نہ کر قبول
لیلےٰ بھی ہم نشیں ہو تو محمل نہ کر قبول

اے جوئے آب بڑھ کہ ہو دریائے تند و تیز
ساحل تجھے عطا ہو تو ساحل نہ کر قبول

کھویا نہ جا صنم کدۂ کائنات میں
محفل گداز! گرمیٔ محفل نہ کر قبول

صبحِ ازل یہ مجھ سے کہا جبرئیل نے
جو عقل کا غلام ہو وہ دل نہ کر قبول

باطل دوئی پسند ہے حق لاشریک ہے
شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول

خاندان صادق پور کا نمونہ

پٹنہ میں ایک محلہ صادق پور ہے۔ یہاں ایک بزرگ مولانا ولایت علیؒ ہوئے

ہیں. مشہور مجاہد فی سبیل اللہ مولانا سید احمد شہید بریلویؒ کے رفقاء میں تھے۔ ان کے بعد ان کی جماعت کے امیر ہوئے۔ سید صاحبؒ کی تحریک مذہبی و سماجی اصلاح کی تحریک تھی۔ لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ مرہٹوں اور سکھوں کی حکومتوں کے مظالم حد سے زیادہ ہو گئے ہیں تو اپنی جماعت کو فوجی شکل دے دی اور اصلاح کی اس تحریک کو جہاد کی تحریک میں بدل دیا۔ سکھوں سے جنگ ہوئی اور وہ اس جنگ میں شہید ہوئے۔ انگریزوں نے سید صاحب مرحوم کی تحریک کو ملک گیر پایا اور نشۂ جہاد سے سرشار، تو ڈرے کہ نزلہ ان کی طرف رجوع نہ ہو اور پھر ان کی گرفت شروع کی۔ انگریز مضبوط تھے اور جماعت کمزور تھی۔ چنانچہ انگریزوں کے دار و گیر کی وجہ سے اس جماعت کے بہت لوگ برباد ہوئے ان برباد شدہ لوگوں میں مولانا ولایت علی کا خاندان بھی تھا۔ انگریزوں کی مخالفت کی تاریخ میں اس خاندان کا صادق پور کے خاندان کے نام سے مشہور ہے، زبردست حصہ ہے۔ اس خاندان کے افراد نے قربانی اور ایثار کی راہ میں کیا نہیں کیا۔ گرفتار ہوئے، تختۂ دار پر چڑھے۔ کالا پانی بھیجے گئے، ان کی جائدادیں ضبط ہوئیں۔ ان کے مکانات کو مسمار کر کے ان پر ہل چلایا گیا۔ لیکن ان تباہ حالوں نے اپنے جوشِ جنوں میں کوئی کمی نہیں کی۔ ان دیوانوں کی دیوانگی بڑھتی گئی۔ سنت کے احیاء کے لئے بے چینی کا وہی حال۔ اس خاندان کے مولانا عبدالخبیر کچھ پہلے تک بقید حیات تھے۔ نوے سال کی عمر پائی۔ بینائی اور سماعت میں فرق آگیا تھا لیکن معلوم ہوتا تھا کہ ہدایت کا چراغ جل رہا ہے۔ اسلام اور مسلمانوں کا کوئی معاملہ ہو، کیا مجال کہ وہ تعاون سے انکار کر دیں۔ ان کی جماعت اپنے کو اہل حدیث کہتی ہے۔ تو کیا عام اہل حدیث کا بھی یہی حال ہے؟ بیشک بہت اللہ کے بندے اس حال میں ہیں لیکن اکثریت اس حال میں نہیں ہے۔ نہ سنت کی پابندی ہے نہ احیائے دین کا جوش، نہ مسلمانوں کی تقویت کی خواہش نہ مظلوموں کی حمایت کا جذبہ ؎

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا

چلے تھے احیاء سنت اور جہاد اسلام کے لئے اور مبتلا ہیں حرص و ہوا میں اور رسم پرستیوں میں اور کب؟ جبکہ ہندوستان کے کروڑوں مسلمان امتحان کے نازک دور سے گذر رہے ہیں جان و مال، عزت و ایمان سب کو یہ چیلنج ہے۔

بدل جاتے تو کچھ رہتے مٹے جاتے ہیں غم یہ ہے

اے سنت کے علمبردارو! اے سید احمد شہید اور اسمٰعیل شہید کے نقوش قدم دیکھنے والو! تمہاری غیرت کو کیا ہو گیا ہے؟ جن بزرگوں نے دین کے لئے دنیا کو کھویا ان کا نام لینے والے دنیا کے لئے دین کو کھو رہے ہیں۔ یہ کیسا سودا ہے؟ یہ کیسی پیروی ہے کچھ تو دل میں ملت کا درد ہونا چاہئے۔

اس عظیم آباد (پٹنہ) میں ہم دیکھتے ہیں کہ اہل حدیث حضرات کی معقول تعداد تجارت پیشہ ہے۔ تاجر پیشہ قوم کو نفع نقصان کا حساب کتاب خوب معلوم رہتا ہے کیا یہ نفع ہے جو وہ کما رہے ہیں؟

بیشک اس کا وقت نہیں کہ تلواریں میان سے باہر کی جائیں۔ تلواروں سے مسائل حل بھی نہیں ہوتے۔ ہم یہ نہیں چاہتے کہ نفرت کا جواب نفرت سے دیا جائے لیکن جو غلط راہ چل رہے ہیں ان کا ہاتھ کیوں نہیں پکڑتے۔ ظالم کو ظلم سے روک کر اس کی مدد کیوں نہیں کرتے۔ ضرورت ہے کہ سب مسلمان ایک ہو کر کہہ دیں ہم گمراہی قبول نہیں کریں گے۔ ہم ظلم کو پنپنے کی اجازت نہیں دیں گے، ہم نفرت کو پھیلنے نہیں دیں گے۔ ہم مل کر رہنا چاہتے ہیں، محبت کا بول بالا کرنا چاہتے ہیں لیکن بے غیرتی کی زندگی قبول کرنا نہیں چاہتے۔

کچھ لوگ ہیں جن کو اتحاد اسلامی سے زیادہ محبوب افتراق اسلامی ہے۔ وہ دین پر مسلمانوں کو متحد نہیں کرتے بلکہ متفرق کرتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ مسلمانوں کے سب ہی حلقے ان دشمنان دین کو مایوس کر دیں اور کسی دیندار مسلمان کے گرد جمع ہو کر محبت و الفت کے گیت گائیں اور پکار کر کہیں ؎

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے ⁂ دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

حق گوئی و بے باکی کی ضرورت

جب ہندوستان پر آزادی کا سورج طلوع نہیں ہوا تھا تو کچھ ہندو تھے اور کچھ مسلمان بھی جو انقلاب زندہ باد کا نعرہ لگا رہے تھے۔ ان میں جدید تعلیم یافتہ ہندو اور دیندار مسلمان اور علماء زیادہ تھے۔ عام ہندو گو کہ تحریک میں پیش پیش نہ تھے لیکن ان کی ہمدردیاں محبان آزادی کے حق میں سو فیصد تھیں۔ عام مسلمان تحریک آزادی میں پیش پیش کیا ہوتے کہ آزادی کی جدوجہد کو بھی وہ اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے تھے۔ اصل میں عام مسلمانوں کی وفاداری مسلمان زمین داروں، مسلمان ملازمین حکومت اور مسلمان وکلاء کے ساتھ تھی جو یہ سمجھتے تھے کہ آزاد ہندوستان میں ان کی حیثیت غلاموں کی ہوگی۔ ان کا کہنا تھا کہ جب انگریز موجود ہیں تو اس وقت بھی ہندو مسلمانوں کو دبانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مجالس قانون ساز کی نمائندگی میں، ملازمتوں میں اور تجارت میں انگریزی پڑھے لکھے مسلمانوں کا مفاد ہندوؤں کے مفاد سے ٹکراتا تھا۔ چھوت چھات کے ذریعہ مسلمانوں کا اور ہریجنوں کا بائیکاٹ تو تھا ہی۔ اونچ ذات کے ہندوؤں کی طرف سے ذبیحہ گاؤ کی جو مخالفت ہوتی تھی اس کا مطلب مسلمان یہ لیتے تھے کہ کھانے پینے اور ان کی پرائیویٹ زندگی میں بھی ہندو مداخلت کرنا چاہتے ہیں۔

ہمارے علمائے دین کو نوکریاں تو ملتی نہیں تھیں، وہ تجارت میں بھی نہیں تھے کہ ان کو ہندوؤں سے مقابلہ کی شکایت ہوتی۔ ان کو صرف یہ خیال تھا کہ ہندوستان اور عالم اسلامی کو انگریز غلام بنائے ہوئے ہیں۔ انگریز جائیں گے تو عالم اسلام آزاد ہوگا۔ ہندوستان میں بھی اگر ہندوؤں سے تعلقات ٹھیک رہے تو کوئی شکایت پیدا نہ ہوگی اور اگر ہوئی تو مسلمان اتنے مضبوط ہیں کہ مقابلہ کر سکیں گے۔ انہوں نے ہندوؤں پر اعتماد کرنے کو کہا اور ہندوؤں کے ساتھ مل کر آزادی کی تحریک میں حصہ

لیا۔ لیکن آزادی کا سورج طلوع ہوا تو مسلمانوں کی طاقت ہندوستان سے نکل کر پاکستان چلی گئی اور پاکستان علیحدہ ملک بن گیا۔ ہندو مسلم کشیدگی اپنے شباب پر پہنچ گئی۔ کہتے ہیں سورج چمکتا ہے تو وہ ہندو مسلمان نہیں دیکھتا۔ وہ دونوں کے گھروں کو یکساں روشن کرتا ہے لیکن آزادی کا سورج صرف ہندو گھروں کو روشن کر سکا۔ مسلمان گھرے اندھیرے میں پڑ گئے۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ نہ جناح صاحب نظر آتے تھے، نہ لیاقت علی، نہ ہندوستانی فوج میں جو مسلمان تھے، ان کا کہیں پتہ تھا۔ نہ ریلوے کے مسلمان ملازمین دکھائی دے رہے تھے نہ ڈاکخانہ کے محکمہ کے مسلمان کارکن موجود تھے، نہ مرکزی سکریٹریٹ کے مسلمان عہدہ دار ہی اپنی کرسیوں پر بیٹھے تھے نہ مسلمان جاسوس ملک میں متحرک تھے۔ سب کے سب ہندوستان کے عام مسلمانوں کو چھوڑ کر جا چکے تھے۔ اللہ کے سوا کوئی بچانے والا نہ تھا۔ بڑے امتحان کا وقت تھا۔

عورت، مرد، بوڑھے بچے کسی کو امان نہیں تھا۔ سب درندوں کے سامنے کھڑے تھے، مال لٹ رہے تھے، عزتیں برباد ہو رہی تھیں، تھوڑے سے شریف ہندو اور کچھ مسلمان جن پر عام مسلمانوں کو کبھی اعتماد نہ تھا، اور جو عام مسلمانوں کی گالیاں برسوں سے سنتے رہے تھے، آگے بڑھ کر مسلمانوں کو بچانے کی کوشش کرتے رہے۔ لیکن کامیاب نہ تھے۔ علماء دین نے سمجھایا کہ یہ اشتعال ہمیشہ نہیں رہے گا۔ وقت آئے گا جب مسلمانوں کو ملک کی خدمت کا موقعہ دیا جائیگا۔

لیکن آزادی کو زمانہ بیت گیا۔ پاکستان میں بھی کامل امن ہے۔ وہاں ہندو مخالف ہنگامہ نہیں ہے لیکن ہندوستان میں وہی بد امنی ہے۔ وہی مسلم دشمنی ہے۔ جان مال کی حفاظت ایک شہری کا بنیادی حق ہے لیکن اس بنیادی حق سے مسلمان محروم ہیں۔ اس حالت میں محروم ہیں کہ حکمراں طبقہ وہ ہے جس کے شانہ سے شانہ ملا کر ہمارے علمائے دین نے جنگ آزادی میں حصہ لیا۔ کیا ہمارے علماء کو اپنے رفقائے جنگ آزادی سے یہ پوچھنے کا حق نہیں ہے کہ ہم عام مسلمانوں

کو کیا جواب دیں۔ کیا وہ یہ کہہ دیں کہ وہ مغالطہ میں تھے اور ان کو ایک پُر فریب قوم سے پالا پڑا تھا
یہ کیا غضب ہے کہ مولانا حفظ الرحمٰن جیسے مجاہد آزادی نے جب مسلمانوں کی ان شکایتوں
کو دہرایا جو جائز تھیں تو چرن سنگھ جیسے لوگ چراغ پا ہو گئے اور مولانا حفظ الرحمٰن جیسے
مجاہد آزادی کو گالیاں دینے لگے۔

ہمیں خوشی ہے کہ ہندوؤں ہی میں کچھ ایسے انصاف پسند پیدا ہو گئے ہیں
جنہوں نے چرن سنگھ کو جواب دیا۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خیر کا
پہلو ہر انسان میں رکھا ہے۔ یہ جوہر خوابیدہ ہو تو دستک دینے سے بیدار ہوتا ہے
ہم کہتے ہیں مسلمان جرأت سے کام لیں، بہت سے ہندو ان کی حمایت میں نکل آئیں
گے۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ تمام ہندوؤں کے دل حق کی حمایت کے جذبہ سے خالی ہوں
لیکن ہماری بد قسمتی یہ ہے کہ ہم خود مرعوب ہیں۔ ہم اظہار حق میں خود تامل کر رہے ہیں
ہم یہ سمجھ رہے ہیں کہ ہماری حق گوئی سے سب کے سب ہندو ناراض ہو جائیں گے
ہم یہ نہیں سمجھتے کہ جو سب حاکموں کا حاکم ہے وہ ہماری حق گوئی سے خوش ہوگا اور
جب وہ خوش ہوگا تو ہمیں کسی کی ناخوشی نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ افسوس ہم نے
چھوٹے چھوٹے فائدے حاصل کرنے کے لئے اپنے لبوں پر مہریں لگالی ہیں۔
یہ طریقہ اس ملت کا نہیں ہو سکتا ہے جسے اجتماعی زندگی کی فکر ہے اور جسے اپنا
مستقبل عزیز ہے۔

اسلام میں محبت والفت، عفو و درگذر کی تعلیم ہے لیکن غیرت بھی ایک
چیز ہے۔ اسلام نے بے غیرتی کی تعلیم نہیں دی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
ہے:

ان اللہ یغار والمومن یغار

(اللہ غیرت کرتا ہے اور مومن بھی غیرت کرتا ہے)۔

یعنی اللہ غیور ہے اور اس پر ایمان لانے والے بھی غیور ہیں۔ اظہار غیرت مومن
کی شان ہے۔ آج اکثریت کی طرف سے سرکاری اور غیر سرکاری سطح پر مسلمانوں کو

پے در پے چرکے دیئے جارہے ہیں۔ جان، مال، عزت و آبرو سب پر حملے ہیں۔ کیا ہم ان زیادتیوں کو برداشت کریں اور ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں؟ حضورؐ نے فرمایا ہے:

الساکن عن الحق شیطان اخرس

(حق بات دیکھ کر خاموش رہنے والا گونگا شیطان ہے)

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

افضل الجہاد کلمۃ حق عند سلطان جابر

(سب سے بڑا جہاد یہ ہے کہ جابر سلطان کے پاس سچی بات کہہ دی جائے)

تو کون ہے جو گونگا شیطان بننے سے گریز کرے؟ آج کون ہے جو افضل الجہاد کے لئے کمر ہمت چست کرے؟ بیشک کچھ لوگ ہیں جو اس فرض کو ادا کرتے ہیں لیکن جب حق مغلوب ہے اور باطل غالب تو اس وقت اس جہاد کو فرض کفایہ ہی رکھا جائے گا؟ کیا نفیر عام کا حکم نہ ہوگا۔ کیا وقت نہیں آیا کہ ہر مسلمان اپنی خوابگاہ سے نکل پڑے؟ جو سوئے ہیں وہ بیٹھ جائیں اور جو بیٹھے ہوں وہ کھڑے ہو جائیں؟ جو گونگے ہوں وہ بولنے لگیں اور یہ نہ کریں کہ دوسرے بولیں اور وہ خاموش رہیں، دوسرے چل پڑیں اور وہ ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھے رہیں۔ دوسروں کے نہ بولنے پر غصہ ہوں اور خود بولنے سے کترائیں اور گھبرائیں اور خوشامدیں کریں جب حقائق آفتاب کی طرح روشن ہوں تو خاموش رہنا اور قوم کو غلط مشورے دینا صریح بے حیائی نہیں؟ وقت آگیا ہے کہ علماء و صوفیاء اور عوام سب اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کریں۔ ہمارے قدم کمزور ہوں تو کمزور صحیح لیکن دنیا یہ نہ کہے کہ مسلمان ذلت پر راضی تھے۔ اپنی زبانیں کھولئے۔ جو سچی بات ہے وہ اس طرح بولئے کہ حکومت کے ایوانوں سے جاکر ٹکرائے امن و امان کی حمایت میں آوازیں بلند ہوں اور ملک کے شرپسند عناصر کو ہندوستان کے سب ہی فرقے مل کر امن و امان سے رہنے پر مجبور کردیں۔

اختلاف وافتراق کی راہ

ایک زمانہ تھا کہ لوگ اپنے باپ دادا کو معیارِ حق مانتے تھے اور کتاب وسنت سے کوشش کر کے زبردستی یہ مطلب نکالتے تھے کہ باپ دادا کا طریقہ صحیح ہے۔ اس کے بعد دوسرا دور آیا کہ وہ بیماری تو اپنی جگہ پر، ایک نئی بیماری نے جنم لیا اور وہ یہ کہ لوگ اپنے اپنے اساتذہ، اپنے اپنے پیرانِ طریقت کو معیارِ حق ماننے لگے۔ ابھی اس کی سمیت عضوِ ملت کو مسموم کر ہی رہی تھی کہ تیسری بیماری نمودار ہوئی اور وہ اپنی اپنی جماعتوں اور انجمنوں کو معیارِ حق ماننے کی بیماری ہے۔ اب حال یہ ہے کہ مسلمان سیکڑوں ٹکڑوں میں تقسیم ہو گئے ہیں۔ کوئی تیار نہیں کہ دوسرے کے ساتھ تعاون کرے، کسی کی ماتحتی قبول کرنا تو بڑی بات ہے۔ تحت الشعور میں یہ جذبہ کام کر رہا ہے کہ چونکہ ہماری جماعت معیارِ حق ہے اس لئے دوسری تمام جماعتیں باطل پر ہیں اور جو اپنی جماعت کے معیار پر پورا نہ اترے اس کے باطل ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے، اس کے ساتھ تعاون حرام ہے۔ اس بارے میں اتنا غلو ہے کہ اپنی جماعت کے کسی اخبار میں کسی دوسری جماعت کا نام بغیر کسی تنقیص کے آگیا یا اس کی تعریف کا کوئی پہلو نکل گیا تو وہ بھی طبیعتوں پر گراں گذرتا ہے اور اسے اہل حق کی مخالفت پر محمول کیا جاتا ہے حالاں کہ چاہئے تھا کہ تمام مسلمان کتاب وسنت کو معیار بناتے، اختلافات کو اسی ترازو پر تولتے، دین کے معاملہ میں کسی سے بھی تعاون کرنے کو تیار رہتے۔ کسی کی ایسی مخالفت نہ کرتے کہ دین کے معاملہ میں بھی اس کی نہ سنیں۔ سب کے سامنے دین ہوتا، اس کے احکام ہوتے، سب اس پر جمع ہوتے، دین کے خلاف کوئی بات ہوتی تو اس سے الگ رہتے خواہ وہ ہمارا آدمی کیوں نہ ہو، دین کے موافق کوئی بات ہوتی تو اس کو قبول کرتے خواہ وہ دشمن کے کیمپ میں کیوں نہ ہو۔

ابن مریم ہوا کرے کوئی ۔ میرے دکھ کی دوا کرے کوئی
روک لو گر غلط چلے کوئی ۔ بخش دو گر خطا کرے کوئی

تمام مسلمانوں کو خواہ وہ حنفی ہوں، شافعی ہوں، مالکی ہوں، حنبلی ہوں، قادری ہوں، چشتی ہوں، سہروردی ہوں، نقشبندی ہوں، دیوبندی ہوں، مقلد ہوں، غیر مقلد ہوں، جمعیۃ علماء والے ہوں، جماعت تبلیغ والے ہوں، جماعت اسلامی والے ہوں، مسلم لیگ والے ہوں، مومن کانفرنس والے ہوں، راعین کانفرنس والے ہوں جمعیۃ عراقین والے ہوں، سب کو کلمہ لاالٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ پر جمع ہونا چاہیئے۔ سب اللہ کے سپاہی ہیں۔ سب کو ایک کمانڈ کے پیچھے کھڑے ہونا چاہیئے

بتانِ رنگ و بو کو توڑ کر ملت میں گم ہوجا
نہ ایرانی رہے باقی نہ تورانی نہ افغانی

کسی فرد یا جماعت سے نفرت کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ اس پر یقین کرنا چاہیئے کہ انسان فطرتاً ہدایت پر ہے لیکن وہ بھٹک بھی جاتا ہے جب بھٹکے تو اس کا ہاتھ پکڑنا چاہیئے۔ صحیح بولے یا کرے تو اس کے شانے سے شانہ ملاکر کھڑے ہونا چاہیئے۔ یہ نہیں کہ اس نے ایک بات غلط کہہ دی تو صحیح باتوں میں بھی اس کا ساتھ نہ دیں۔ ہر شخص کی اچھی باتوں کی قدر کرنا چاہیئے بری باتوں سے اجتناب۔

چونکہ مسلم کارکنوں میں تنگ نظری بہت ہے اس لئے وہ یہ نہیں دیکھتے کہ کیا کہا جا رہا ہے۔ وہ یہ دیکھتے ہیں کہ کون کہہ رہا ہے۔ اگر اپنے حلقہ کا آدمی ہے تو ٹھیک ہے ورنہ غلط۔ یعنی پارٹی کے لیبل پر نظریں رہتی ہیں دین پر نہیں۔ کاش یہ سب کانگریس اور مسلم لیگ سے سبق لیتے۔ آزادی سے پہلے دونوں جماعتیں ایک دوسرے سے معرکہ آرا تھیں۔ لیکن آزادی کے بعد دونوں جماعتیں کیرالا میں ایک دوسرے سے تعاون کر رہی ہیں کیونکہ اسی صورت میں کانگریس کا اقتدار باقی رہتا ہے اور مسلم لیگ کی اہمیت باقی رہتی ہے۔ تو کیا مسلمان اس بات کو نہیں سوچ سکتے کہ ان کے اتحاد اور تعاون باہمی کے ذریعہ ہی وہ زندہ رہ سکتے ہیں۔

اپنے ہدایت یافتہ ہونے کا بیجا گھمنڈ انسان کو گمراہ کرتا ہے۔ ہر لمحہ اپنا احتساب کرنا چاہیئے اور دوسروں کو گمراہ قرار دینے کی جگہ اپنی اصلاح کی فکر کرنی چاہیئے۔ ہر علاقہ کے مسلمانوں کی بیماریاں الگ ہیں۔ اتر پردیش کے علماء میں نزاع باہمی کی بیماری بہت زیادہ ہے۔ ان کا مناظرہ اور مجادلہ یوپی سے نکل کر ہندوستان کے دور دراز خطوں میں پہنچتا ہے۔ دوسرے مقامات کے علماء میں اس حد تک نزاع باہمی نہیں ہے۔ مثلاً بہار کو لے لیجئے۔ یہاں کے بڑے بڑے علماء مولانا محمد علی مونگیری مولانا شاہ سلیمان پھلواروی مولانا شاہ بدر الدین امیر شریعت اول، مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد ناظم اعلیٰ جمعیۃ علماء الہند سید سلیمان ندوی رحمہم اللہ نے اس طرح کے جدال اور مناظرہ بازی کو پسند نہیں کیا جو یوپی کے علماء میں جاری وساری ہے اور انھوں نے اس سے اپنی بے زاری کا اظہار کیا ہے۔ بہار کے مسلمانوں میں ایک دوسری بیماری ہے جو شرمناک حد تک شرفاء وصلحاء کے گھروں تک پھیل گئی ہے اور وہ تلک کی بیماری ہے۔ شادی بیاہ میں بہار کے مسلمانوں میں تلک کا رواج ہندوؤں سے آیا ہے۔ لڑکے والے لڑکی والوں سے تلک اور جہیز کا مطالبہ کرتے ہیں۔ یہ ساری گمراہیاں خدا کے عذاب کو دعوت دینے والی ہیں۔

بے حیائی کے اڈے

بہت زمانہ کی بات نہیں ہے، امریکہ کی "کیتھرائن میو" انگریزی حکومت کی مدد سے ہندوستان کے کونے کونے میں گھومیں اور بقول گاندھی جی، میونسپلٹی کے جمعدار کی طرح انہوں نے اس ملک کی برائیوں کا جائزہ لیا اور "مدر انڈیا" کے نام سے ایک کتاب مرتب کی۔ مقصد تالیف کا یہ تھا کہ دنیا کو یہ بتایا جائے کہ ہندوستانی حکومت کرنے کے اہل نہیں ہیں اور یہ انگریزوں کا احسان ہے کہ وہ ہندوستان پر حکومت کرتے ہیں۔ ہندوستان میں اس کتاب کے خلاف آواز اٹھائی گئی۔ بعضوں نے الزامی جواب کے طور پر

امریکا کی برائیوں کو جمع کر کے شائع کیا لیکن الزامی جواب دے کر ہم اپنے چہرے کا داغ نہیں مٹا سکتے ہیں۔ ہم مخالف شخص کو خاموش البتہ کر سکتے ہیں لیکن داغ تو چہرے پر رہے گا ہی اور دیکھنے والوں کو بدنما معلوم بھی ہوگا۔

کوئی شک نہیں کہ ہم اس وقت جب مدر انڈیا لکھی گئی تھی، مجبور تھے۔ وسائل اپنے ہاتھوں میں نہ تھے۔ حکومت پر قبضہ انگریزوں کا تھا جو یہ چاہتے تھے کہ ہندوستان کی حالت جیوں کی تیوں رہے۔ اس لئے اس وقت ہماری جدوجہد کا مرکز آزادی کا حصول اور وسائل پر قبضہ کرنا تھا۔ چنانچہ گاندھی جی نے مس میو کا یہی جواب دیا تھا کہ "ہم انہی برائیوں کو دور کرنے کے لئے اختیار کے طالب ہیں۔" لیکن اب ہم آزاد ہو چکے ہیں اور اب ہم سماجی اصلاح کی طرف متوجہ بھی ہیں اس لئے وقت آ گیا ہے کہ ہم اپنی خرابیوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر معلوم کریں اور ان کو ہم سب مل کر دور کریں۔ اس موقعہ پر یہ کتاب "مدر انڈیا" ٹھیک ہو سکتی ہے جس نے ہمارے عیوب کی نشاندہی کی ہے۔

ہم اپنی کن برائیوں کا ذکر کریں۔ ہولی کے موقعہ پر فحش گانے، عورتوں کو چھیڑنا، رنگ اور رنگ سے آگے بڑھ کر غلاظتوں کو راہ گیروں پر پھینکنا، گالیاں بکنی، ایسے جلوس نکالنا جن کو دیکھ کر بے حیائی اور بے شرمی بھی ماتم کرے، ہمارے ملک کا قدیم دستور ہے۔ ہماری حکومت نے آزادی کے بعد اس طرف توجہ کی ہے۔ ہر سال ہولی کے موقعہ پر کچھ اقدامات کئے جاتے ہیں لیکن یہ اقدامات اتنے موثر نہیں ہیں جتنا کہ ہونے چاہئیں۔ ضرورت ہے کہ ہم تعلیم و تربیت کے محاذ پر بھی اس کے خلاف کام کریں۔ اور اس بے حیائی کے سوتے جہاں جہاں ہوں ان کو بند کریں۔ مدر انڈیا میں ایسی بعض بنیادی چیزیں ہم کو ملتی ہیں۔ مثلاً ذیل کی چند سطریں ملاحظہ ہوں:۔

> "شیو سب سے بڑے ہندو دیوتاؤں میں ہے۔ سڑکوں کے کنارے مندروں میں، گھروں کے اندر، بلند چبوتروں پر، اور افراد کے پاس بطور گنڈے اور تعویذ کے اس کی مورتی اس طرح بنائی جاتی

ہے کہ اس کی شرمگاہ ظاہر ہو اور اس شکل سے وہ مورتیاں جانوروں کی قربانیاں قبول کرتی ہیں۔ وشنو کے پیرو جنوبی ہند میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اس کی پیشانی پر شرمگاہ کے نشانات تے ہیں۔"

آگے چل کر اس کتاب میں کیتھرائن میو لکھتی ہیں:

۱۲ دسمبر ۲۳ء میں جنیوا میں فحش باتوں کو روکنے کے لئے بین الاقوامی دستور مرتب ہوا۔ اس کی بنار پر ہندوستان کی مجلس قانون ساز میں بھی ضابطہ فوجداری میں ترمیم لائی گئی جس کا مسودہ یہ تھا کہ جو شخص کسی فحش چیز، کتاب، تمثیل یا مورتی کو بیچے گا، کرایہ پر دے گا، تقسیم کرے گا، پہنچائے گا یا نفع کمائے گا (وہ فوجداری جرم کا مرتکب ہوگا) اس ترمیم کا بعض لوگوں نے خیر مقدم کیا لیکن مجالس قانون ساز کے بعض دوسرے ممبروں کی کوشش سے اس میں یہ اضافہ کر دیا گیا کہ یہ دفعہ کسی ایسی کتاب، پمفلٹ، تحریر اور نقش و نگار پر نافذ نہیں ہوگی جو مذہبی مقاصد کے لئے ہوں یا جو کسی مندر پر کندہ ہوں یا جہاں پر مورتیاں رکھی گئی ہوں۔"

ایسا کیوں ہوا؟ ایسا اس لئے ہوا کہ ہمارا اخلاقی احساس بیدار نہیں ہے۔ جن باتوں سے کراہیت ہونی چاہئے، اگر وہ مذہب کے راستہ سے آتی ہوں تو کراہیت مٹ جاتی ہے۔ ہم نہیں سمجھتے کہ بے حیائی کی باتیں مذہب سے تعلق نہیں رکھتی ہیں۔ یہ لوگوں کی اضافہ کی ہوئی باتیں ہیں۔ تقدس کے راستہ سے اپنی قوم کے دماغ میں بےحیائی اور فحاشی کو جگہ دیں گے تو ہولی کے موقعہ پر یا دوسرے موقعوں پر جو کچھ ہوتا ہے یا ہوگا اس کا رونا ہی کیا ہے اور اس کا استیصال ممکن کیسے ہے؟

شائستگی جن برائیوں کو دور کرنے کا تقاضہ کرتی ہے کم از کم ان سے تو ہمیں ان بھائیوں کو روشناس کرانا چاہیئے جو خوابِ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔ ہمسایوں کے کچھ حقوق ہوتے ہیں۔ یہ بھی ان بھائیوں کا ہم پر حق ہے کہ ہم ان کی غلطیوں کی

نشاندہی کریں اور ان کو سدھارنے میں حصہ لیں۔ ضرورت ہے کہ ہر سماج سیوک ہندو مسلمان سکھ عیسائی ملک کی ہر برائی کو پر امن طور پر اور پسندیدہ طور پر دور کرے۔ محض اسلئے کہ یہ برائی ہمارے فرقہ میں موجود نہیں، ہمارا بے تعلق رہنا انسانیت نہیں ہے۔ ہم سب انسان ہیں سب ہندوستانی ہیں، ایک دوسرے کو سدھارنا ہم سب کا فرض ہے۔

آج فحش تصاویر کے خلاف بعض شائستہ حلقوں سے آوازیں اٹھتی ہیں، ان حلقوں کو چاہئے کہ سماج سے اس برائی کو ختم کریں جس سے فحش باتوں کی ہمت افزائی ہوتی ہے۔

بتایئے برائیاں کیوں نہ پیدا ہوں۔ عبادت خانوں میں اس طرح کی مورتیاں رکھی ہوں۔ عورتیں کم سن، جوان، بوڑھی، پوجا کے لئے جائیں اور عموماً ایک ایک کرکے جائیں کہ اجتماعی عبادت کا دستور ان میں نہیں، پجاری تمام بشری کمزوریوں کے ساتھ وہاں موجود ہوں، پھر کون طاقت ہے جو برائی کو روک سکے؟

مسلمان اپنی معاشرتی زندگی میں بعض برائیاں قبول کئے ہوئے ہیں مثلاً بعض جگہ سالے، سالیوں، سمدھی سمدھنوں سے فحش مذاق کا رواج ہے۔ ان کو چاہئے کہ ان برائیوں کو اپنے اندر سے دور کریں اور پھر اہل وطن کی برائیوں کو دور کرنے کی کوشش کریں، محبت اور ہمدردی کے ساتھ۔

افسوس یہ ہے کہ اب برائی اور بے حیائی کے احساسات مردہ ہوتے جا رہے ہیں۔ مخرب اخلاق فلموں نے بے حیائی اور بے شرمی کی باتوں کو عام کر دیا ہے۔ عریاں فلموں کے دیکھنے کا رواج بڑھتا جا رہا ہے۔ فلمی گانے، ریڈیو اور لاؤڈ اسپیکر پر ہر جگہ سنائے جا رہے ہیں۔ شہوانی احساسات کو جگانے والے پوسٹر شہر کی دیواروں پر ہر جگہ نظر آتے ہیں۔ ٹیلی ویژن اور ویڈیو کے بڑھتے ہوئے رواج نے ہر گھر کو سینما گھر بنا دیا ہے۔ بچے، جوان، بوڑھے، مرد اور عورتیں سب مل کر بے حیائی کی باتوں کو دیکھتے ہیں۔ کسی کو اس بات کا احساس نہیں کہ یہ باتیں

اسلام کی تعلیم کے خلاف، حیاء اور شرم کے منافی اور عفت و عصمت کی حفاظت کے نظام کی دشمن ہیں۔

قرآن میں ہے:

ان الصلوٰۃ تنھیٰ عن الفحشاء والمنکر

(نماز بے حیائی اور گناہ سے روکتی ہے)۔

اگر مسلمانوں کی نمازیں زندہ نمازیں ہوتیں تو انہیں ان گناہوں کا شدت کے ساتھ احساس ہوتا لیکن آج نماز کے ساتھ ہر فحش اور منکر کا ارتکاب کیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری نمازیں بے روح ہیں۔ ان نمازوں سے جان نکل گئی ہے۔ قرآن میں آدم اور ابلیس کا قصہ بار بار آیا ہے۔ قرآن میں موجود ہے کہ شیطان نے قیامت تک آدم کی ذریت کو بہکانے کا عزم کر رکھا ہے اور آدم کو بہکانے کے لئے شیطان نے ابلاغ عامہ کے ذرائع، پریس، صحافت، ریڈیو اور ٹیلی ویژن اور فلم پر قبضہ کر رکھا ہے۔ خدا کی مخلوق ابلاغ عامہ کے ان ذرائع کے ذریعہ گمراہ ہو رہی ہے۔ ان ذرائع کے ذریعہ صبح و شام جو باتیں پھیلائی جا رہی ہیں ان سے انسان کا کیا مزاج بن رہا ہے۔ یہ مزاج ہے لذتیت کا سطحیت کا، عیش کوشی اور لذت اندوزی کا، دنیا کے عیش و آرام کو اور عارضی زندگی کی تھوڑی کامیابی کو مقصد حیات بنا لینے کا۔

تاریخ میں پیغمبر، انسان کے اسی فاسد مزاج کو ختم کرنے کے لئے آتے ہیں پیغمبر آخرت کو جیتی جاگتی حقیقت بتانے اور اس کا یقین دل میں بٹھانے کے لئے آتے ہیں۔ شیطان کی اس دور میں کامیابی یہ ہے کہ آخرت کے ماننے والوں میں بھی آخرت سے غفلت پیدا ہو رہی ہے۔ اور دنیوی زندگی کی چمک دمک اور رونق کے جال میں وہ پھنستے چلے جا رہے ہیں۔ چونکہ قرآن کی شکل میں آسمانی کتاب محفوظ ہے اور حضورؐ کی تعلیمات محفوظ ہیں اس لئے اب کوئی پیغمبر نہیں آئیگا لیکن کوئی پیغمبر آتا تو ان بے حیائی کے اڈوں کو ضرور بند کرتا جہاں سے بداخلاقی اور

لذت پسندی کے جراثیم معاشرہ میں تیزی کے ساتھ پھیلتے ہیں۔

اردو کی حفاظت

اردو زبان ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل جول سے بنی اس لئے دونوں کی ذمہ داری ہے کہ اس کی حفاظت اور ترقی کی کوشش کریں۔ ہندوؤں پر زیادہ ذمہ داری ہے اس لئے کہ اکثریت میں وہ ہیں اور آریہ سماجیوں کی تو یہ مذہبی زبان ہے اور مسلمانوں پر کم ذمہ داری ہے کیونکہ وہ اقلیت میں ہیں۔ اور ان کی مذہبی زبان عربی ہے، اردو نہیں ہے۔ لیکن ہندو دوست اپنی تعداد کے شایانِ شان اس کی حمایت پر آمادہ نہیں بلکہ زیادہ تر مخالف ہیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے مسلمانوں کو تنہا اس کی حفاظت کرنی پڑے گی۔ اب حکومتِ ہند اردو کی ترویج و اشاعت پر توجہ دے رہی ہے لیکن اس کا کیا اعتبار، پارٹی بدلنے پر پالیسی بدل سکتی ہے۔

اب مسلمانوں کے ذمہ دو کام رہیں گے۔ ایک تو یہ کہ وہ ہندی زبان پر عبور حاصل کریں تاکہ ہندوستان کے واقف کار شہری بن سکیں اور حکومت کی کارروائیوں سے لاعلم نہ رہیں اور دوسرے تن تنہا اردو کی حفاظت بھی کریں۔ اگر مسلمانوں نے بیک وقت اردو ہندی دونوں زبانوں پر توجہ دی تو غیر شعوری طور پر ہندی کے مزید الفاظ اردو میں داخل ہوں گے اور فارسی و عربی کے الفاظ کم ہو جائیں گے جو بہت بین الاقوامی زبانیں ہیں جو ہم کو ایشیا کی دوسری قوموں سے قریب کرتی ہیں اور جن کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح اردو کی شکل بدل جائے گی اور وہ عملاً ہندی ہو جائے گی اس لئے میری رائے ہے کہ مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ عربی سیکھیں اور عربی اور ہندی دونوں سیکھنے سے اردو کی موجودہ شکل باقی رہے گی اور ہندی اور عربی الفاظ کا موجودہ توازن باقی رہے گا اور جزیرہ نمائے ہند جزیرہ نہ بن سکے گا کہ ایشیا کے دوسرے ملکوں سے بے تعلق اور علیحدہ ہو جائے اور یہ خیال پھر عام ہو جائے کہ سمندر پار کرنا

دھرم کے خلاف ہے۔

عربی سیکھنے سے جہاں اردو میں زندگی اور تازگی آتی رہے گی وہاں یہ فائدہ بھی ہوگا کہ ہم عالم اسلام سے بہت قریب رہیں گے۔ مشرق وسطیٰ کی زبان تو عربی ہے ہی ویسے تمام دنیا میں عربی جاننے والے ملتے ہیں۔ خود ہندوستان میں عربی جاننے والوں کی اتنی بڑی تعداد ہے کہ عربی پڑھانے والوں کو تلاش نہیں کرنا پڑے گا، وہ ہر جگہ مل جائیں گے۔ عربی سیکھنے کا تیسرا فائدہ اور سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ ہم اپنے دین سے بلاواسطہ اور ترجمہ کی مدد کے بغیر واقف ہو سکیں گے اور یہ بھی ہوگا کہ ہم تلاشِ روزگار کے لئے عرب ملکوں میں جائیں گے تو کم از کم وہاں کے نام تو صحیح لے سکیں گے ابوظبی کو ابودھبی اور ظہران کو دہران تو نہیں کہیں گے اور عربی زبان بولنے اور لکھنے کی صلاحیت پیدا ہوگی تو یہ بہت فائدہ کی بات ہے۔

اس لئے اگر ہم اردو کی حفاظت چاہتے ہیں، عالم اسلامی سے رابطہ مضبوط بنانا چاہتے ہیں اور اپنے دین سے بلاواسطہ واقف ہونا چاہتے ہیں تو آیئے ہم عہد کریں کہ ہم عربی سیکھیں گے، عربی سکھائیں گے۔

یاد رکھئے، اردو کی حفاظت عربی اور ہندی دونوں پر توجہ کرنے سے ہوگی۔

یہ خوشی کی بات ہے کہ ہمارے ہندو اہل وطن کثرت سے عربی سیکھ رہے ہیں۔ دیکھنا ہے کہ مسلمان اپنا حصہ کتنا ادا کرتے ہیں۔

ہندوؤں میں عربی زبان سیکھنے کا شوق پیدا ہو جائے اور مسلمانوں میں یہ شوق نہ پیدا ہو تو یہ بڑے افسوس کی بات ہے۔ عربی زبان کی تعلیم سے نہ صرف یہ کہ دین سے واقفیت ہوگی بلکہ اردو کی بھی حفاظت ہوگی۔

ہندی زبان اور مولانا آزاد

شری گیڈگل نے اس بناء پر ہندوستان کی کابینہ سے استعفیٰ دے دیا تھا

کہ جواہر لال مشرقی پاکستان پر حملہ کرنے کو تیار نہیں ہوئے اور انہوں نے کہا کہ جب تک ہم رئیس الوزراء ہیں ہم جنگ نہیں کریں گے حالانکہ کہا جاتا ہے کہ کابینہ کی اکثریت کی رائے تھی کہ پاکستان پر حملہ کیا جائے۔

شری گیڈگل کے خیالات ہندی زبان کے بارے میں بھی قابل ذکر ہیں۔ انہوں نے بمبئی صوبائی راشٹر بھاشا کے جلسہ تقسیم اسناد کو خطاب کرتے ہوئے کہا:

"آزادی کے ابتدائی پندرہ سال ہندی کو انتظامیہ زبان بنانے کے لئے کافی تھے اگر مولانا آزاد جو اس وقت وزیر تعلیم تھے، مضبوط ارادہ رکھتے۔ مولانا آزاد بڑے عالم تھے، موثر ایڈمنسٹریٹر تھے ممتاز ماہر تعلیم تھے لیکن ان کے دل میں ہندی کے لئے محبت نہیں تھی۔ انہوں نے مرکزی حکومت میں جو سماں باندھا تھا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندی کوئی حقیقی ترقی نہ کر سکی۔"

شری گیڈگل نے سلسلۂ تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا کہ جنوبی ہند والوں کو یہ خطرہ ہے کہ ہندی انگریزی کی جگہ لے لے گی تو مرکزی حکومت میں ان کی ملازمت کے لئے موقعہ نہیں رہے گا۔ انہوں نے اس کا حل یہ پیش کیا کہ ملازمت کی جگہیں تناسب آبادی کے لحاظ سے مقرر کردی جائیں لیکن پارلیمنٹ نے اس تجویز کو منظور نہیں کیا۔

شری گیڈگل کی ہمت بلند ہے۔ وہ "ہندی ہندو ہندوستان" کے لئے ملک کو خطرہ میں ڈال سکتے ہیں۔ سارا ہندوستان بھسم ہو جائے لیکن ان کا نعرہ اونچا رہے یہ ہے ان کے دل کی آواز اس لئے وہ نئے ہندوستان کو جسے اپنی طاقت بنانے کے لئے بہت کچھ کرنا ہے۔ جنگ میں فوراً جھونکنے کو آمادہ اور مستعد تھے اور اس سے انکار پر ان کو اتنی چڑھ ہوئی کہ انہوں نے اپنے بڑے عہدے پر لات ماردی اور شاما پرشاد مکرجی کے ساتھ کابینہ سے مستعفی ہو گئے۔ اس لئے وہ مولانا آزاد سے شاکی

ہیں کہ جنوبی ہند کی مخالفت کا کیوں خیال کیا۔ اور کیوں نہیں زبردستی ہندی زبان نافذ کردی۔ اگر اس کی وجہ سے ہندوستان کے مزید 'ٹکڑے' ہوجاتے تو ہوجاتے لیکن مولانا آزاد کے جذبات ایسے نہ تھے۔ انہوں نے ملک کی آزادی کے لئے پچاس برس پاپڑ بیلے تھے، اپنی آرام کی زندگی کو خیرباد کہا تھا، عزیزوں سے لاپرواہ ہوگئے تھے۔ ان کی بیوی اس حال میں مریں کہ وہ جیل میں تھے اور وائسرائے کی طرف سے بغاوت کا مقدمہ چلانے کی دھمکیاں تھیں۔ انہوں نے پاکستان کے مطالبہ کی حمایت نہیں کی کیونکہ انہیں ملک کے ٹکڑے ہوجانا منظور نہ تھا۔ اس کے لئے انہوں نے اپنوں کی گالیاں سنیں مشتعل مسلمانوں کا سامنا کیا۔ ان کے دن بے چینی میں گذرتے تھے اور راتوں کو انہیں نیند نہیں آتی تھی۔ سوچتے رہتے کہ مسلمانوں کو کسی متبادل فارمولا پر راضی کریں اور ملک کے ٹکڑے نہ ہونے دیں۔ ملک کے ٹکڑے ہوئے تو انہوں نے اس کا انجام بھی دیکھا۔ کروڑوں ہندو اور مسلمان تاریخ کے سخت ترین مصائب میں مبتلا ہوئے مولانا آزاد کب راضی ہوسکتے تھے کہ عجلت پسندی کی بنا پر غیر ہندی صوبوں میں بغاوت کی آگ پھیلنے دیں؟ اگر انہیں ملک کی پرواہ نہ ہوتی تو مدراس، بنگال وغیرہ صوبوں کے جذبات کا خیال نہ کرتے اور جبراً ہندی نافذ کردیتے اور حکومت کو، نئی آزاد حکومت کو، جسے اپنی قوت بنانے کے لئے بہت کچھ کرنا ہے، مشکلات میں ڈال دیتے اور باہر کی حکومتوں کو مداخلت کا موقع دے دیتے۔ اس لئے مولانا آزاد نے مرکزی حکومت میں احتیاط کی فضا پیدا کی۔ سنری گیڈگل کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان پر ہندی زبان کا نشہ چڑھا ہوا ہے اور مولانا آزاد پر حب الوطنی کا، جو ہندی زبان کو فوراً ملک کی زبان بنانے کے خلاف ہیں انہیں ہندی زبان میں کئی طرح کی کمزوریاں نظر آتی ہیں۔ آخر کچھ تو ہے کہ ہندی زبان نے کوئی عظیم شخصیت پیدا نہیں کی۔ رابندرناتھ ٹیگور کو بنگلہ زبان نے پیدا کیا۔ راجندر پرشاد اور مولانا آزاد کو اردو نے، گاندھی اور پٹیل کو گجراتی زبان نے راجہ جی اور رادھا کرشنن کو، مدراسی زبان نے وغیرہ وغیرہ۔ غریب رادھا کرشنن کو جو ہندو مذہب کے اس دور میں سب سے بڑے ترجمان

تھے، ایک جلسہ میں ہندی کے حامیوں نے اس لئے بولنے نہیں دیا کہ وہ ہندی میں تقریر نہیں کر سکتے تھے۔ موجودہ ہندوستان کے معمار جواہر لال بھی ہندی زبان کی پیداوار نہیں ہیں۔ وہ تو خواب بھی انگریزی میں دیکھتے تھے۔

اردو ہندی کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ اس کے افعال ہندی کے ہیں اور اسمار ہندی کے علاوہ دوسری زبانوں سے بھی لئے گئے ہیں۔ اس کا رسم الخط ہمیں ایشیا، افریقہ کے باشندوں سے قریب کرتا ہے۔ اگر اس حقیقت کو مان لیجئے اور اس کو انگریزی کی جگہ نافذ کیجئے تو ہم بڑے فخر کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہندی نے بہت عظیم شخصیات پیدا کیں لیکن ہم بدقسمتی سے ہندی کی ترقی یافتہ شکل کو ہندی نہیں مانتے۔ اگر مان بھی لیتے تو بھی اس کو غیر ہندی والوں کو ناراض کر کے نافذ کرنا دانشمندی کی بات نہ ہوتی۔

ہم یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ ہم کسی خاص زبان سے محبت کرتے ہیں، ہم تو انسان سے محبت کرتے ہیں۔ انسان کے منہ سے جو آواز نکلتی ہے وہ ہمیں بھلی لگتی ہے۔ ہم انسان کی ترقی اور بھلائی کے خواہش مند ہیں، اس میں انسانیت کی خوبو چاہتے ہیں۔ اس کے اندر سے درندہ پن کو دور کرنا چاہتے ہیں۔ جس خطہ کی ذمہ داری ہم پر ہوگی ہم سب سے پہلے اس کو دیکھیں گے۔ اور اس کی درستگی کی کوشش کریں گے۔ ہم ہر محب وطن سے یہی توقع رکھتے ہیں اور اسی کو حب الوطنی سمجھتے ہیں۔ ملک کے اندر کشت و خون کی فضا پیدا کرنا حب الوطنی کے خلاف ہے۔

ہم اردو کو بہتر سمجھتے ہیں لیکن ملک کی اکثریت نے جب اس کے خلاف فیصلہ دیا اور بقول راجہ جی، صرف ایک ووٹ کی اکثریت سے ہندی کی حمایت ہوگئی تو ہم نے اس فیصلہ کو مان لیا کیونکہ ہم ملک میں کشیدگی پیدا کرنا نہیں چاہتے تھے۔ ہم نے مان لیا کہ ہندی ملک کی سرکاری زبان بنے گی لیکن اس کے لئے انتظار کرنا ہوگا۔ یہاں تک کہ بنگال، پنجاب، مدراس، کیرلا، آندھرا پردیش، گجرات، مہاراشٹر ہندی زبان کو قبول کرلیں اور کسی کو یہ خیال نہ ہو کہ ان کا حق مارا جا رہا ہے۔

اردو بہر حال ملک کی چودہ زبانوں میں سے ایک زبان ہے لیکن جب شری گیڈگل نے مذکورہ بالا بیان دیا تھا تو کسی حامیٔ اردو نے شکایت نہیں کی تھی حالانکہ اردو کے لئے کچھ نہیں کیا گیا تھا۔ اب ۲۵ برسوں کے بعد کچھ اقدامات ہوتے ہیں۔ یو پی میں اردو کے ساتھ جو بے انصافیاں ہوئیں ان کو اب دور کرنے کے ارادے ہیں۔ اردو والوں نے جس صبر سے کام لیا، ہندی والوں کو بھی اسی صبر سے کام لینا چاہئے۔ جس پر جتنی زیادہ ذمہ داری ہے اس کو اسی قدر زیادہ متحمل ہونا چاہئے۔

اردو والے ہندوستان میں ہی نہیں، پاکستان میں بھی صبر کر رہے ہیں۔ ہندوستان میں تو ہندی نے انگریزی کی جگہ کافی لے لی لیکن پاکستان میں انگریزی جوں کی توں رہی۔ اس لئے ایسا ہوا کہ وہاں کے اصلی باشندے اردو نہیں جانتے۔ صرف شہروں میں اردو کے جاننے والے ملیں گے۔ لیکن وہاں کی حکومت نے یہی فیصلہ کیا ہے کہ سرکاری زبان اردو ہوگی۔

ہم خود یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان میں انگریزی کی جگہ ہندی لے لے اور اس نے بہت حد تک لے بھی لیا ہے۔ انگریزی غلامی کی یادگار ہے لیکن جو حکومت چلا رہے ہیں ان کو انگریزی کی جگہ کسی اور زبان پر عبور نہیں، وہ اسی انگریزی میں کام کر سکتے ہیں۔ عوام یعنی کسان اور مزدور انگریزی سے نا بلد ہیں۔ اگر انگریزی زبان کو باقی رکھا جائے گا تو انگریزی زبان کا سامراج بنے گا، ملک کی بڑی اکثریت محکوم رہے گی۔ یہ قابلِ تعریف ہے کہ جہاں حالات ساتھ دے رہے ہیں، حکومت انگریزی کو ختم کر رہی ہے۔

بہر حال ہندوستان میں دو گروہ ہیں۔ ایک گروہ والے ہندوستان کو ہر قیمت پر متحد رکھنا چاہتے ہیں اور دوسرا گروہ ملک کی مزید تقسیم کا خطرہ مول لینے کو تیار ہے۔ مولانا آزاد اسی پہلے گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔

نشہ بندی

انسان کو قدرت سے جو سب سے بڑی نعمت ملی ہے وہ عقل کی نعمت ہے عقل کے سہارے وہ بڑے بڑے کام کرتا ہے۔ جو چیز عقل کو ضائع کرنے والی ہے وہ بہت بری ہے۔ خواہ تھوڑی دیر کے لئے عقل ضائع ہو۔ کون جانتا ہے کس لمحہ میں انسان کیا کرے گا۔ شراب اور دوسری منشیات انسان کو بے عقل کر دیتی ہیں۔ کچھ دیر کے لئے اس کی عقل جاتی رہتی ہے۔ اس زمانہ میں ایک ایک دقیقہ کی قیمت ہے۔ وقت ضائع کرنے والے ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ جاتے ہیں۔ پھر اسی بے عقلی کی حالت میں جو نشہ خوری کی بدولت پیدا ہوتی ہے انسان ظلم اور بے حیائی کے کاموں کے کام مرتکب ہوتا ہے، بیوی کو چھوڑ دیتا ہے، مار پیٹ کرتا ہے، خون خرابہ ہوتا ہے۔ اسی لئے اسلام نے شراب کو حرام قرار دیا ہے اور دنیا کے سب اچھے لوگوں نے اس کو برا جانا ہے۔ ہندوستان سادھوؤں، سنتوں اور صوفیوں کا دیس ہے۔ جو جھگڑا پیدا کرے، جو برائی پیدا کرے، جو گھریلو نظام اور گھریلو معیشت کو برباد کرے اسے دیس میں سراہا نہیں جا سکتا۔ اس دیس میں دیس کی آزادی کے لئے ایک سنت مہاتما نے ہماری رہنمائی کی تو شراب کی بھٹیوں پر پہرے بٹھا دیئے۔ اس جرم میں وہ خود بھی قید ہوا اور نہ جانے کتنے مرد عورتیں بوڑھے جوان اس کے کہنے پر قید خانوں میں گئے۔ کتنے پولیس کی لاٹھیوں سے زخمی ہوئے۔ ملک آزاد ہوا تو آئین میں یہ بات رکھی گئی کہ نشہ بندی سارے ملک میں لاگو کر دی جائے گی۔

بد قسمتی سے ہمارے ملک میں پہلے بھی طرح طرح کی برائیاں تھیں اب اور بڑھ گئی ہیں۔ دوسروں کو نقصان پہنچا کر اپنی تجوریاں بھرنا پونجی پتیوں کا شیوہ ہے۔ وہ اس میں کوئی حرج نہیں سمجھتے کہ ایک مزدور کے ہاتھ شراب کی بوتل بیچ دی جائے اور وہ اسے پی کر بدمست ہو کر اپنی بہن، اپنی بیٹی کی آبرو لے یا اپنے ننھے منے بچوں کا گلا دبا دے یا اپنی بیوی،

کو چھوڑ دے یا آرام کی زندگی اس پر حرام کردے، اس میں تو ان کا فائدہ ہے۔ مزدور تیار نہ ہوگا تو وہ ہمیشہ غریب کیونکر رہے گا، پونجی پتی نہیں بنے گا؟ ان کی برابری نہیں کرے گا؟ ان کو آنکھیں نہیں دکھائے گا؟ پونجی پتی کے سامنے تو پیسہ ہے۔ کسی طرح پیسہ آنا چاہئے ملک برباد ہو جائے تو ہو جائے۔ چنانچہ یہ لوگ نشہ بندی کے خلاف آواز اٹھانے لگے کہنے لگے سرکاری مالیہ میں کمی ہو جائے گی۔ بہت سارے تعمیری کام نہیں ہو سکیں گے۔ یعنی معاشرہ کو بچانا تعمیری کام میں داخل نہیں ہے حکومت پہلے ہے اور عوام بعد میں وہ بھول گئے کہ حکومت عوام کی ہے۔ عوام پہلے ہیں اور حکومت بعد میں، عوام کی فلاح وبہبود کے لئے حکومت ہے جس بات میں عوام کا فائدہ نہ ہو اس کو نہیں ہونا چاہئے، خواہ حکومت ٹوٹ جائے اور ختم ہو جائے۔

ہمارے ملک کے مہاجنوں نے کبھی کسی کو اخلاق کی بنیاد پر مہاجن (قوم کا بڑا فرد) سمجھا ہی نہیں۔ انہوں نے سمجھا کہ جس کے پاس روپے ہیں وہی مہاجن ہے۔ جس کے اخلاق اچھے ہیں، جو دوسروں کے لئے ایثار سے کام لے وہ مہاجن نہیں ہے۔ انہوں نے ہمیشہ اخلاقی نقطۂ نظر سے نیچ کام کئے۔ کم ناپنا، کم تولنا، اپنے ملک کا مال چوری چھپے دوسرے ملکوں کو پہنچا دینا، ٹیکسوں سے بچنے کے لئے دوسرے ملکوں سے چوری چھپے مال منگانا، ملک میں دنگے فساد کرانے کے لئے دوسرے ملکوں سے ناجائز اسلحے حاصل کر کے کمسن نادان نوجوانوں کو دینا تاکہ وہ مسلمانوں کو پریشان کریں، چیزوں کی قیمتیں حد سے زیادہ بڑھا دینا، تیل کو گھی کہہ کر بیچنا، پانی کو دوا کی جگہ دینا آٹے میں مٹی ملانا، غرض ان فریب کاریوں اور انسان دشمنیوں میں ان کو کمال ہے اور نوکر شاہی ان کی مدد کرتی ہے جہاں نشہ بندی ہوئی وہاں ناجائز بھٹیاں موجود۔ شراب کی ناجائز کشید ہونے لگی۔ پھر چلانے لگے۔ شراب کی ناجائز کشید کو روکنے کے لئے نشہ بندی کو ختم کرو۔ حالانکہ نعرہ یہ لگنا چاہئے تھا کہ تعزیرات ہند کا خوف دلوں سے نکل گیا ہے اس میں مقررہ سزائیں کافی نہیں لوگ اب ایسی معمولی سزاؤں سے نہیں ڈرتے نشہ بندی کے لئے زیادہ سخت سزائیں مقرر کرو، جو حکومت عوام سے قانون کا احترام

نہ کرا سکے اس کو بدل دو، اگر اس طرح کے نعرے ہوتے تو مؤثر ہوتے اور معقول ہوتے
اس میں تو کوئی معقولیت نہیں کہ قانون کی خلاف ورزیاں ہو رہی ہیں اس لئے قانون
کو ختم کر دو، پابندیاں اٹھا دو یہ دنیا میں چوریاں، ڈکیتیاں ہوتی ہیں قتل کے واقعات
ہوتے ہیں ان کے لئے سزائیں مقرر ہیں کوئی نہیں کہتا کہ چوریاں نہیں رکتیں اس لئے
چوری کی سزا اٹھا دی جائے قتل ہوتے ہیں اس لئے قتل کی سزا منسوخ کر دی جائے۔
بہرحال جب ہمارا معاشرہ بگڑا ہوا ہے تو ہر طرح کی نامعقول باتیں کہی جائیں گی
اس سے ہمیں بددل نہیں ہونا چاہیئے جتنی زیادہ برائی کی حمایت ہو اتنا ہی زیادہ اچھائی
کی حمایت میں کوشش ہونی چاہیئے۔

بنارس سے ایک وفد پدیاترا کر کے لکھنؤ گیا تھا اس کی مانگ تھی کہ یوپی کی
حکومت یوپی میں شراب بند کرے۔ ۴/اکتوبر ۶۲ء کو وفد پیدل چلتے ہوئے لکھنؤ پہنچا
اور اس نے وزیر اعلیٰ شری گپتا سے بات کی۔ وزیر اعلیٰ نے فرمایا کہ شراب سے ملنے والی
آمدنی کی انہیں سخت ضرورت ہے کیونکہ یوپی کے عوام کی بھلائی کے لئے دوسرے
پنچسالہ منصوبہ پر عمل کرنا ہے۔ اگر شراب کی اس آمدنی کو سرکار چھوڑ دے تو اسے اتنی
رقم لوگوں کی بھلائی کے لئے کم ہاتھ آئے گی۔ یہ خبر ان لوگوں کے لئے چونکا دینے والی
ہے جو اس پر غور نہ کر سکے کہ سیکولرزم کی حدیں کہاں تک پہنچائی جائیں گی۔ اب تک
تو ہم سیکولرزم کا مطلب یہی سمجھتے تھے کہ ہر مذہب کو پھلنے پھولنے کا موقع ملے گا اور
ان کا احترام کیا جائے گا لیکن ہمیں سمجھایا جا رہا ہے کہ حکومت کسی بھی دین کی پابند نہیں
اور جب اس کا کوئی دین ہی نہیں تو وہ اس کی پرواہ کیوں کرے، کہ دنیا کے سب
مذاہب شراب نوشی کو برا سمجھتے ہیں اور دنیا کے سب مذاہب میں اچھے مقصد تک
پہنچنے کے لئے اچھا ذریعہ اختیار کرنا بھی ضروری ہے۔ وہ حلال و حرام کی قید میں
کیوں پڑے جس ذریعہ سے بھی آمدنی ہو، خواہ شراب کی تجارت سے ہو خواہ عصمت
فروشی سے ہو، خواہ ڈاکہ ڈال کر ہو حکومت کا خزانہ بھرنا چاہیئے۔ اس کی فکر کیوں ہو
کہ لوگ نشہ میں بدمست ہو کر کس کی عزت لوٹتے ہیں، کس کے گھر میں چوری

کرتے ہیں، کسی کی دوکان میں آگ لگاتے ہیں، کسی کو قتل کرتے ہیں، اگر مذاہب اس بداخلاقی کی فضا میں تب پنپ سکیں تو نہ پنپیں، اس کا کیا بگڑتا ہے۔ اگر کسان اور مزدور اپنا روپیہ تاڑی (شراب) میں لگا دیتے ہیں اور ان کی بیویاں بھوکی مرتی ہیں ان کے بچے بلکتے ہیں، نشہ میں اگر وہ اپنی بیوی کے سر پھوڑتے ہیں تو اس سے حکومت کے کسی ذمہ دار کا کیا بگڑتا ہے۔ دیکھا سیکولرزم کے مفہوم کو کہاں تک وسیع کیا گیا ہے؟

وزیر اعلیٰ نے یہ بھی مشورہ دیا کہ دیہاتوں میں جا کے لوگوں کو سمجھایا جائے کہ وہ نشہ کو ترک کر دیں۔ لیکن جب حکومت چاہتی ہی نہیں کہ نشہ بندی ہو، اس کو اپنی آمدنی کم ہو جانے کا خطرہ ہے تو یہ مشورہ کیوں کہ جا کر لوگوں کو سمجھاؤ؟ یہ مشورہ قوم کے قوت عمل کو جان بوجھ کر ضائع کرنے کی نیت سے تو نہیں ہے؟ یا اس نیت سے کہا گیا ہے کہ دیکھیں آپ کس طرح نشہ بندی کراتے ہیں، ہم تو نہیں ہونے دیں گے؟ اگر یہ بات ہے تو ہندوستان کے سب فرقوں کو چاہیئے کہ اس چیلنج کا مقابلہ کریں اور ملک میں نشہ بندی کرا کر ہی دم لیں۔

ہم یہ بات سمجھ لیں کہ جب تک حکام ذمہ دار نہ ہوں گے، حکومت کا کوئی قانون رائج و نافذ نہ ہوگا۔ ہمیں سب سے پہلے حکام کی اصلاح کرنی ہے اور اس معاشرہ کی جس سے یہ حکام پیدا ہوتے ہیں۔ اور حکومت کی باگ صرف ان ہاتھوں میں دینا چاہیئے جو ایمان داری سے شراب بندی کے حامی ہوں۔ اور جو اس راستہ میں عملی قدم اٹھائیں۔ ہمیں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ جب تک کل ہند پیمانے پر حکومت کی کوششیں نہ ہوں گی، کسی ایک یا دو صوبہ میں کوئی کوشش کامیاب نہ ہوگی۔

جن کا کوئی مذہب ہی نہیں، جو اخلاقیات کو کوئی اہمیت ہی نہیں دیتے، ہم ان سے کیا کہیں؟ ہمیں دیکھنا ہے کہ گاندھی بھگت اس سلسلہ میں کیا کر رہے ہیں؟ مسلمانوں کے یہاں جس شدت سے شراب نوشی کی ممانعت ہے، کیا وہ شراب نوشی چھوڑ کر اور شراب نوشی کی مخالفت کر کے انسانیت کی خدمت کریں گے اور ملک میں اپنی افادیت ثابت کریں گے؟

صاف اور غیر مشتبہ پالیسی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو متوجہ کرنے کے لئے ایک لفظ "راعنا" تھا۔ اس کا مطلب ہے "ہماری سنئے"۔ یہودی راعنا کو کھینچ کر راعینا کہتے تھے۔ اس کا مطلب ہے "ہمارا چرواہا"۔ اس سے مقصود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تضحیک ہوتی تھی۔ لیکن اگر ان کو کہا جاتا کہ تم رسول کی تضحیک و توہین میں نیت سے ایسا بولتے ہو تو وہ کہہ سکتے تھے کہ توہین مقصود نہیں بلکہ ہم سب مثل مویشی ہیں اور وہ مثل چرواہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس موقع پر یہ ہدایت فرمائی کہ "راعنا" نہ کہو بلکہ "انظرنا" کہو۔ "راعنا" میں التباس ممکن تھا لیکن "انظرنا" میں التباس ممکن نہیں تھا۔ اسے مخاطب کرنے کی غرض سے ہی استعمال کیا جاسکتا تھا۔ اس کے اندر کوئی دوسرا پہلو نہ تھا۔

اس واقعہ سے ہمیں سبق ملتا ہے کہ ہمیں ایسے الفاظ میں بات کرنی چاہئے جو غیر مشتبہ، واضح اور متعین ہوں۔ مشتبہ، غیر واضح اور غیر متعین (VAGUE) الفاظ اور جملوں کے استعمال سے ہمیں بچنا چاہئے۔ کہ ان کی تہ میں فتنے پنہاں ہیں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو متشابہات سے بچنے کی اسی لئے تنبیہ فرمائی ہے۔ معاملات میں صفائی اور متعین طریقہ اختیار کرنے پر اسی لئے زور دیا گیا ہے۔

غور سے دیکھئے تو فسادات اور جھگڑوں کی بنیاد غلط فہمیاں ہوا کرتی ہیں اور ان کو ہوا ہماری سخت مزاجی اور تند و تیز اور مشتبہ طریق گفتگو نے دی ہے۔ ہماری گفتگو میں غلط فہمیوں کی گنجائش نہیں ہونی چاہئے۔ پرانے زمانے میں لوگ اپنی قوت کے بھروسہ پر صاف اور واضح لفظوں میں کسی سے کوئی وعدہ نہیں کرتے تھے اور وقت پڑنے پر اپنی بات کا جو مطلب چاہتے تھے بیان کر دیتے تھے۔ اور دوسری پارٹی کو اس کا پابند بناتے تھے۔ چنانچہ سیاسیات میں بھی وہ سب سے زیادہ عقلمند سمجھا

جاتا تھا جو سب سے زیادہ مغالطہ آمیز گفتگو کر سکتا ہو۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کمزور طبقہ نے بھی دھوکہ اور فریب کی راہ اختیار کی اگر دھوکہ اور فریب کی راہ اختیار کیجائے تو ظاہر ہے کہ کمزور طبقہ ہی اس کا سب سے زیادہ مستحق ہوگا کہ وہ دھوکہ اور فریب کو طاقت کے بدلے استعمال کرے۔ اس طرح غیر شعوری طور پر طبقاتی تصادم شروع ہوا ہے اور سچائی کو قبول کرنے، سچی بات کو ظاہر کرنے اور سچائی کی حمایت کرنے کا جذبہ فوت ہوگیا ہے۔ اپنی مصلحت سے لوگ سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ کہنے لگے، مصالح و تعصب اور طرفداری کی بناء پر کسی چیز کی حمایت اور مخالفت کرنے لگے۔ حقیقتوں کے اعتراف کو بے وقوفی سمجھا جانے لگا رفتہ رفتہ بات یہاں تک بڑھی کہ ہماری معاشرت نمود و نمائش اور دھوکہ و فریب کی بنیاد پر کھڑی ہوگئی اور بری چیز اچھائی میں شمار ہونے لگی۔ ہماری تہذیب کی بہت معمولی چیز لے لیجیے، اس کی تہ میں دھوکہ اور فریب اور کذب پائیں گے۔ مثلاً اظہار انکساری کے لئے ہم اپنے کو ناچیز، احقر، ہیچمداں وغیرہ لکھتے ہیں حالانکہ لکھنے والے اپنے کو ایسا نہیں سمجھتے۔ کوئی دوسرا ہمارے لئے یہی احقر، ناچیز، ہیچمداں وغیرہ لکھ دے تو ہم چراغ پا ہو جائیں گے اور اس میں اپنی توہین سمجھیں گے، ہم کو اس سے تکلیف ہوگی گویا ایسے الفاظ ہم محض دکھانے کے لئے لکھتے ہیں اس میں حقیقت پنہاں نہیں ہوتی۔ ہم غلط سمجھتے ہوئے بھی ان الفاظ کو استعمال کرتے ہیں۔ ہم اس خیال سے مطمئن رہتے ہیں کہ رواج میں اس طرح کی منافقت ہے جس کو رائج رہنا چاہئے اور برداشت کرنا چاہئے۔

ہمارا جو سماج اس طرح کے جھوٹ اور کذب کی بنیاد پر قائم ہوا ہے وہ دنیا میں سچی باتوں کے مقابلہ کی تاب نہیں لا سکتا اس لئے یہ سماج بکھرتا اور پریشان ہوتا جا رہا ہے۔ اگر ہم دنیا کی عظیم قوم بننا چاہتے ہیں تو ہمیں سچائی کی بنیادوں پر اس سماج کو پھر سے بنانا ہوگا۔ یہ صحیح ہے کہ اسلام کی دی ہوئی سچائی ہمارے سماج کی بنیاد تھی لیکن وہ سماج اس بنیاد سے ہٹ گیا ہے۔ اگر ہمیں سنبھلنا اور آگے بڑھنا ہے اور گذشتہ ناکامیوں اور پسپائیوں کی تلافی کرنی ہے تو ہمیں اس کھوٹ اور کمزوری کو دور کرنا ہوگا اور سچائی کی اس بنیاد پر پھر سے آنا ہوگا۔

ہم قومی کارکنوں، بالخصوص مبلغین و داعیان اسلام کو توجہ دلاتے ہیں کہ وہ غیر حقیقی غیر واقعی اور غیر متعین طرز زندگی کو چھوڑ کر حقیقت پسندی اور سچائی کو اپنا شعار بنائیں اور بولنے میں متشابہات سے پرہیز کریں۔ کسی حال میں کسی کو مغالطہ میں نہ ڈالیں۔ سچی، صاف اور کھری بات ہی آج کی سماجی بیماریوں کا علاج ہے۔ یہ ٹھیک ہے جہاں پر جھوٹ اور کذب کا رواج ہو وہاں سچائی پر کوئی یقین نہیں کرے گا۔ اس سے ہمیں بددل نہیں ہونا چاہیئے۔ مسلسل اور پیہم سچائی کا اعلان بالآخر لوگوں کو سچائی پر مجبور کرے گا کہ وہ سچائی اور کذب میں فرق کریں۔

ہماری دعوت یہ ہے کہ ہم صحیح کو صحیح کہیں اور غلط کو غلط۔ اگر کہیں تلبیس ہو تو ہم صحیح اور غلط کو الگ الگ کردیں۔ نہ کسی وقت خود مغالطہ کا شکار ہوں اور نہ دوسروں کو مغالطہ میں رکھیں اور یقین جانیں آخر فتح سچائی کی ہوگی۔ ہمیں صاف اور غیر مشتبہ پالیسی کا پرچار کرنا چاہیئے اور اس سلسلہ میں لوگوں کی مخالفت اور ملامت کی پرواہ نہیں کرنی چاہیئے۔

رہنما بننے کا ذوق

بڑھئی بے سیکھے بڑھئی نہیں بن سکتا۔ لوہار بے سیکھے لوہار نہیں بن سکتا، کمہار بے سیکھے کمہار نہیں بن سکتا۔ جس نے پڑھا نہیں وہ کسی سے پڑھے بغیر پڑھا ہوا نہیں کہلا سکتا۔ لیکن جس نے راستہ نہ پایا ہو، جسے منزل کا پتہ نہیں ہو وہ رہنما ہو سکتا ہے۔ آج ہمارے اکثر رہنما اور لیڈر ایسے ہی ہیں۔ نہ انہوں نے کبھی سوچا کہ انہیں کہاں جانا ہے اور نہ انہوں نے کسی راہ رو کے ساتھ چل کر راستہ کا پتہ چلایا یعنی نہ منزل تک پہنچنے کا انہیں کوئی شوق ہے۔ ان کی منزل تو نام و نمود اور پیسہ ہے۔ وہ قوم کو منزل تک پہنچانے کا کوئی درد بھی نہیں رکھتے لیکن ہیں لیڈر۔ نتیجہ یہ ہے کہ رہنمائی اور لیڈری کے الفاظ اب برے مفہوم میں استعمال ہونے لگے ہیں۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی لیڈر تھے، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہم بھی لیڈر تھے۔ یہ حضرات کس طرح لیڈر بنے تھے؟ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں رہے، آپ کے قدموں سے لپٹ کر تربیت حاصل کی۔ انہوں نے اپنا مقصد یہ نہیں بنایا تھا کہ بادشاہت کریں گے اور ملک فتح کریں گے۔ انہوں نے تو دنیا سے برائی مٹانے کا عزم کیا تھا، طرح طرح کی اذیتیں سہی تھیں۔ جتنا دکھ اٹھاتے تھے اتنا ہی منزل تک پہنچنے کی لگن بڑھتی تھی اور اتنا ہی ان کے جوہر کھلتے تھے۔ جب ۲۳ برسوں تک آفتابِ نبوت کی روشنی میں کام کر چکے تو ان میں ہر ایک قطب ستارہ تھا جو اندھیری رات میں مسافر کو منزل کا راستہ دکھاتا ہے۔

دنیا کے بڑے بڑے لیڈر بھی گھِس گھِس کر اور ٹھوکریں کھا کھا کر اور قوم کے لئے خونِ جگر پی پی کر لیڈر بنے تھے اور دوسروں کے چراغ سے انہوں نے اپنا چراغ جلایا تھا۔ آج یہ حال ہے کہ "فکر لیڈر کو بہت ہے مگر آرام کے ساتھ"

ہندوستان میں مولانا مملوکؒ کے فیضِ صحبت نے مولانا قاسم نانوتوی اور سرسید احمد خاں کو پیدا کیا، سلیمان ندوی کو شبلی نے، حسین احمد کو محمود الحسن نے۔ مولانا آزاد نے بہار اور کلکتہ اور ایرانی انقلابیوں کی صحبتوں سے فائدہ اٹھایا۔ گاندھی جناح اور حسرت نے ملک اور گوکھلے وغیرہ سے سیکھا۔ جواہر لال نہرو نے موتی لال نہرو کے گود میں اور گاندھی جی کی سرپرستی میں برسوں آبلہ پائی کی مشقت برداشت کی۔ جو ان راہوں سے گذرے وہ سلطنت بھی اچھی چلا سکے۔ لینن، اسٹالن، نہرو، سوکارنو، ناصر، ٹیپو وغیرہ سیکڑوں نظیریں ہیں، یہ سب کامیاب لیڈر تھے۔

آج لیڈر بننے کا شوق عام ہو گیا ہے۔ جس نے کھڑے ہو کر لکچر دے دیا، جس نے دو سطریں لکھ دیں بس وہ پر تولنے لگا۔ نہ فکر میں صحت، نہ عمل میں اخلاص، نہ جد وجہد میں استقامت، نہ دوسروں کے عقل و تجربہ سے فائدہ اٹھانا، نہ اپنے پاس عقل و تجربہ کی پونجی، سوائے خوشامد، جھوٹ اور لڑائی کے کچھ نہیں جانتے لیکن لیڈر بننے اور خود کو لیڈر کہلانے کا شوق ہے ؎

گر ہمیں مکتب است و ایں ملاؔ
کارِ طفلاں تمام خواہد شد

افسوس یہ ہے کہ جو مسلمان اس میدان میں مرد ہیں، نہ ان میں اس کا شوق ہو کہ اپنی رفاقت میں رکھ کر جوانوں کی تربیت کریں تاکہ ان کے سچے جانشین بن سکیں اور نہ جوانوں کو شوق ہے کہ اپنے بزرگوں پر بھروسہ کریں۔ نئی نسل کے لوگ بوڑھوں کو برا سمجھتے ہیں۔ اگر کوئی بوڑھا با اثر اور با اقتدار ہے تو اس کی ہاں میں ہاں ملا کر اس کی خوشامد کرتے ہیں اور اس سے کچھ سیکھنا نہیں چاہتے۔ اپنی صلاحیتوں کے بارے میں ان کو غلط فہمی رہتی ہے اور وہ غرور و پندار کے نشہ میں چور رہتے ہیں۔ اور پھر ان نوجوانوں کو تعمیری اور ٹھوس کاموں کا شوق بھی نہیں ہے۔ الا ماشاء اللہ۔ یہ نمائشی اور ہنگامی کاموں کی طرف ہی دوڑتے ہیں۔

ضرورت ہے کہ بچے کھچے ذی صلاحیت اور مخلص رہنما جو موجود ہیں ایسی مشنری کی تشکیل دیں جس میں نوجوانوں کا ذوق پاکیزہ بن سکے۔ اور بلند مقاصد کے لئے جینا اور مرنا اپنا شیوہ بنالیں اور قوم کی قسمت پلٹ سکیں۔

باعقوبت دوزخ برابر است

ہمارے بعض دوست یہ سمجھتے ہیں کہ چند غیر مسلم رہنماؤں کی خوشامد کر کے وہ عزت پالیں گے۔ وہ دوسروں کی بخشی ہوئی عارضی عزت کو عزت سمجھتے ہیں۔ وہ اسمبلی کی ممبریوں اور وزارتوں کو ہی بڑائی سمجھتے ہیں حالانکہ یہ بھیک کے ٹکڑے ہیں۔ اگر ہم نے ان کو التجاؤں اور خوشامدوں کے ذریعہ حاصل کیا تو ان میں کوئی عزت نہیں۔ عزت اس میں ہے کہ ہم اپنی صلاحیتوں سے اور اپنی طاقت سے اعلیٰ مقامات پر فائز ہوں۔ جس چیز کو ہم نے اپنا خون اور پسینہ بہا کر حاصل نہیں کیا وہ ہمارے لئے ننگ ہے ؎

مسلماں کو ہے ننگ وہ بادشاہی ؛ خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے

ایسا بننا چاہیئے کہ خوشامد کی جائے کہ حضرت یہ ذمہ داری قبول کر لیجئے۔ دوسروں کی خوشامد کرنے سے عزت نہیں ملتی، اصل چیز ہے ذاتی جوہر اور ہنر۔ ہم دعاگو ہیں کہ ہم رضائے الٰہی کے لئے اپنا تن من دھن لگائیں۔ عزت اور ذلت اسی کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے عزت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے ذلیل کرتا ہے۔ وہی بادشاہتوں کا مالک ہے، جس کو چاہتا ہے حکومت دیتا ہے جس سے چاہتا ہے چھین لیتا ہے۔ خیر و شر اسی کی طرف سے ہیں۔ وہ چاہے گا تو ہمیں انعام و اکرام سے نوازے گا۔ اگر اس کا غیض و غضب ہوگا تو ہمارے لئے محرومی اور پسماندگی کے سوا اور کیا ہوگا۔

ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ بعض دوستوں کی خوشامد ان کے کام نہ آئی۔ ان کے بعض وزراء سے تعلقات بھی تھے لیکن ان کی خواہش کے باوجود وہ کرسیٔ وزارت پر فائز نہیں ہوئے۔ پس ان کی خوشامد نہ کیجئے جو بے بس ہیں، جو باوجود شوکت و حشمت کے اختیار و اقتدار کے حالات کے آگے سپر ڈالنے پر مجبور ہو جاتے ہیں بلکہ اس ذات واحد سے التجا کرنی چاہیئے جو بے بسوں اور مجبوروں کو زمین کا وارث اور حاکم بنا دیتا ہے۔ انسان کس کس سے التجا کرے گا، یہاں تو کروڑوں بت ہیں، یہ پیشانی کہاں کہاں جھکے گی۔ بہتر ہے ایک ہی کو اپنا معبود بنایا جائے۔

ءارباب متفرقون خیر ام اللہ الواحد القہار (یہ طرح طرح کے رب بہتر ہیں یا ایک اللہ قہار) ؎ دوسروں کی بخشی ہوئی دولت و عزت عذاب ہے، رحمت نہیں ہے ؎۔

حقا کہ با عقوبت دوزخ برابر است
رفتن بپائے مردی ہمسایہ در بہشت

مبلغین اسلام کی توجہ کے لئے

شیریں زبانی منشائے ربانی اور تقاضائے سنت ہے۔ شیریں زبانی انبیاء

اور صلحاء کو محبوب ہے۔ شیریں زبانی سے بگڑی بات بن جاتی ہے۔ شیریں زبانی سے تبلیغ و تلقین کا کام باحسن وجوہ انجام پاتا ہے۔ کسی مقصد جلیل کو کامیاب بنانے کی جدوجہد کرنے والے کارکنوں کو شیریں زبان بننا چاہیئے۔ اشاعتِ دین اصل واہم مقاصد میں سے ہے جس کو بغیر شیریں زبانی حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ شیریں زبانی سے ہم عوام الناس کی ہمدردیاں حاصل کرسکیں گے۔ ان کو اپنی دوستی اور خیر خواہی کا یقین دلاسکیں گے اور ان کے سامنے اسلام کو پیش کرسکیں گے جس کو قبول کرکے دارین کی سعادت حاصل ہوگی۔

عہد وسطیٰ میں غیر اسلامی جاگیردارانہ نظام سے مسلمان بھی متاثر ہوئے۔ اس تاثر نے ان کے اندر وہ تمام نظریئے پیدا کردیئے جو جاگیرداری نظام کو چلانے کے لئے ضروری تھے۔ ان نظریات نے ان کو مخصوص عادات کا حامل بنادیا۔ کبر و نخوت، اپنے خاندان کی اور اپنی تہذیب کی بڑائی، دوسروں کی، دوسروں کے خاندانوں کی، دوسروں کی تہذیب کی تحقیر، تحکم، ڈانٹ ڈپٹ گالی گلوج وغیرہ۔ جاگیردار تہذیب کی کہاوت ہے: "راتڑ ذات لیتاتے بنتو" (کمینے مار پیٹ سے ہی ٹھیک ہوتے ہیں)، یہ کہاوت زباں زد عام و خاص ہوئی۔ رذالت اور شرافت کسبی چیز ہی نہیں رہی، بلکہ موروثی قرار پائی۔ ظاہر ہے، ان امراض میں مبتلا قوم کسی بڑے اسلامی انقلاب کے برپا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔

ضرورت ہے کہ ہم ان برائیوں کو مٹائیں۔ مساوات اور برابری کا تصور کریں، انسان انسان کی عزت کرے۔ یہ اصول سب کے لئے ہونا چاہیئے۔ یہی عقیدہ ہمیں شیریں زبانی پر بھی اکسائے گا ورنہ اگر ہمارے دل میں یہ بات رہی کہ "فلاں آدمی نسلی طور پر حقیر و ذلیل ہے تو پیالہ سے وہی چھلکے گا جو پیالہ میں ہے"۔ تو ہم انسانوں کو حقیر ہی سمجھیں گے اور سامنے صرف دکھاوے کے لئے عزت کرینگے۔ بغیر شیریں زبانی ہم کوئی کار نمایاں انجام نہیں دے سکتے۔ ہمیں اپنی عادتیں بدلنی ہوں گی۔ ہمیں کوشش کرنا چاہیئے کہ کوئی غلط بات زبان سے نہ نکالیں اور صحیح بات

بھی میٹھی زبان میں کہنا چاہئے تاکہ مخاطب کو اپنی عزت نفس کا احساس ہو اور اسے کوئی تکلیف نہ پہنچے۔

ایک عزیز نے پاکستان کا ایک رسالہ جو بچوں کے لئے ہے، مجھے دیکھنے کو دیا۔ اس میں مختلف اخلاقی مضامین ہیں۔ گرچہ یہ بچوں کا رسالہ ہے لیکن بالغ انسانوں کے لئے کم مفید نہیں ہے۔ اس میں میٹھی بات کے عنوان سے جو کچھ لکھا گیا ہے اسے ہم درج ذیل کرتے ہیں تاکہ ہمارے قومی و مذہبی کارکن توجہ کریں اور عمل کر سکیں۔

ایک بات دس طرح سے کہی جا سکتی ہے۔ ہمیشہ یہ خیال رکھو کہ ان بہت طریقوں میں سے اچھا طریقہ کون سا ہے۔ اگر تمہیں پیاس لگے تو تم کسی سے یوں بھی کہہ سکتے ہو کہ:

"ابے، پانی لاؤ۔"

یہی یوں بھی کہہ سکتے ہو کہ ——— "بھائی! ذرا پانی پلانا۔"

یوں بھی کہہ سکتے ہو کہ: "ذرا پانی پلا دیجئے۔"

یوں بھی کہہ سکتے ہو کہ "آپ ثواب کمائیں گے، مہربانی کر کے پانی پلا سکتے ہیں؟ غرض ایک ہی بات کو کئی طرح سے ادا کیا جا سکتا ہے۔ جو طریقہ سب سے اچھا ہے وہی کام میں لانا چاہئے۔ پھر یہ بھی یاد رکھو کہ لہجہ کے بدل جانے سے بات کچھ کی کچھ ہو جاتی ہے۔ اچھے سے اچھے لفظ کو اگر خراب اور سخت لہجے میں ادا کیا جائے تو بات میٹھی نہیں رہتی بلکہ کڑوی ہو جاتی ہے۔ اگر نرم لہجے سے کہو ذرا پانی پلا دیجئے تو اس کا اثر اچھا ہوگا اور اسی بات کو ڈانٹ کر کہو تو بہت بیہودہ سی بات ہو جائے گی۔ پھر بڑی چیز جس کا خیال رکھنا ضروری ہے وہ یہ کہ جس سے بات کرو اس کی عمر کا اور اس سے اپنے رشتہ کا خیال رکھو۔ چھوٹوں سے جب بات کرو تو پیار سے کرو۔ بڑوں سے جب کہو تو ادب سے کہو۔ جب برابر والوں سے بولو تو محبت سے بولو۔

بات میں مٹھاس پیدا کرنے کیلئے پہلے یہ دیکھنا چاہئے کہ تم کس قسم کی بات کر رہے ہو۔ کوئی حکم دے رہے ہو یا کوئی درخواست کر رہے ہو، کوئی واقعہ بیان کر رہے ہو یا گلہ شکوہ کر رہے ہو، خوشی ظاہر کر رہے ہو یا رنج و افسوس، کسی کی تعریف کر رہے ہو یا برائی، سچ مچ کسی بات پر اپنی رائے کا اظہار کر رہے ہو یا ہنسی مذاق کر رہے ہو۔ تم جس قسم کی بات کرو پہلے یہ دیکھ لو کہ اس کے لئے کون سا لفظ، کون سا لہجہ اور بیان، کون سا طریقہ زیادہ میٹھا اور پیارا ہو سکتا ہے فرض کرو تم اپنے سے چھوٹے یا ما تحت کو کوئی حکم دے رہے ہو تو سختی سے اور بری طرح کوئی حکم نہیں دینا چاہئے۔ کوئی لفظ ایسا منہ سے نہ نکالو جس سے اس کی بے عزتی ہوتی ہو۔ کسی سے درخواست کرتے وقت ایسا معلوم نہیں ہونا چاہئے کہ تم حکم چلا رہے ہو یا دباؤ ڈال رہے ہو۔ اگر کوئی شخص مر گیا ہے اور اس کے یہاں افسوس اور ہمدردی کرنے جاؤ اور وہاں قہقہے لگا کر باتیں کرو تو یہ کیسا غلط طریقہ ہو گا۔ اسی طرح ہنسی مذاق اور دل لگی کی باتوں میں رونی صورت بنا لینا کس قدر بے موقعہ بات ہو گی۔ ہر موقع اور محل کی بات الگ قسم کی ہوتی ہے اور وہاں اسی قسم کی میٹھی زبان اختیار کی جاتی ہے اچھے ڈھنگ سے بات کرنے کی عمدہ مثال شیخ سعدی نے دی ہے وہ لکھتے ہیں:۔

ایک بادشاہ نے خواب دیکھا کہ اس کے تمام دانت جھڑ گئے ہیں۔ اس نے اس کی تعبیر دریافت کی۔ ایک تعبیر بتانے والے نے کہا کہ آپ کا سارا خاندان آپ کے سامنے مر جائے گا۔ اس پر بادشاہ کو غصہ آ گیا اور اس نے اس تعبیر بتانے والے کو سخت سزا دی۔ دوسرے تعبیر بتانے والے نے کہا، سبحان اللہ! کیا اچھا خواب ہے

آپ کی عمر سارے خاندان سے زیادہ ہوگی۔ بادشاہ کو یہ تعبیر پسند آئی اور اس نے اس دوسرے شخص کو انعام دیا۔ دیکھو! دونوں تعبیر بتانے والوں کا مطلب ایک ہی تھا۔ بادشاہ کے سامنے اس کا سارا خاندان مرے گا یا اس کی عمر اس کے خاندان والوں میں سب سے زیادہ لمبی ہوگی، دونوں کا مطلب ایک ہی ہے لیکن کہنے کا ڈھنگ الگ الگ ہے، ایک بہت برا اور دوسرا بہت اچھا۔ بس اس مثال کو یاد رکھو اور جب بھی کسی سے بات کرو تو سوچ سمجھ لو کہ اپنا مطلب ظاہر کرنے کے لئے کون سا طریقہ سب سے اچھا، سب سے میٹھا اور سب سے پیارا ہو سکتا ہے۔ قرآن پاک نے ان تمام باتوں کا خیال رکھنے کے لئے ان تین لفظوں میں ہدایت دی ہے:۔

قولوا للناس حسنیٰ۔"

بچوں کے لئے اوپر جو بات کہی گئی ہے، امید ہے بڑے بھی اس کا خیال رکھیں گے سخت باتوں کا نقصان کافی محسوس کیا جا رہا ہے اور اب لوگوں کا خیال ہو چلا ہے کہ اگر امن قائم رکھنا ہے تو سخت باتوں سے پرہیز کرنا چاہیئے۔ آیئے ہم امن و سلامتی کے مذہب کو پھیلانے کے لئے سخت باتوں سے پرہیز کریں۔ پیار و محبت کامیابی کی راہ ہے پیار کا مطلب ہے قصور معاف کرنا، وقت پڑنے پر کام آنا اور نرمی سے بات کرنا۔

ہندوستان میں مغربی جمہوریت

جب کسی نظریہ کی اشاعت بڑھ جاتی ہے، اس کے ماننے والے بہت ہو جاتے ہیں تو اس کی تعبیر میں اختلاف ہو جاتا ہے اور اس پر اتنے طریقہ سے عمل کیا جاتا ہے کہ حکم یہ فیصلہ نہیں کر سکتا کہ وہ نظریہ حقیقتاً صحیح، منصفانہ اور نفع بخش ہے یا غلط، ظالمانہ اور مضر۔ جمہوریت کے نظریہ کا بھی کم و بیش یہی حال ہے۔

مغربی جمہوریت کی تاریخ یوں شروع ہوئی کہ اہل برطانیہ کو سامراج سے تکلیف پہنچی۔ تدریجی طور پر عوام نے اختیارات بادشاہ سے اپنی طرف منتقل کئے اور بادشاہ نام کے رہ گئے۔

برطانیہ کی حکومت امریکا میں بھی تھی اور برطانیہ کی ایک نسل بھی وہاں آباد تھی۔ نسل نے یہ پسند نہیں کیا کہ برطانیہ کی حکومت تو اس پر ٹیکس لگائے، محصول وصول کرے لیکن اس حکومت میں اس کا کوئی دخل نہ ہو۔ اس نے محصول دینے سے انکار کیا تا وقتیکہ برطانوی پارلیمنٹ میں اس کا کوئی نمائندہ نہ لیا جائے۔ رجعت پسند برطانیہ نے مطالبہ کو نہ مانا، امریکہ کو کھو دیا۔ اب امریکا میں برطانوی باشندوں کی آزاد حکومت قائم ہو گئی۔

فرانس نپولین کی قیادت میں بڑھا۔ پھر پیچھے ہٹ گیا۔ شکست ہوئی تو اپنی کمزوریاں بھی دکھائی دینے لگیں۔ صدائیں اٹھیں کہ حکومت میں جمہور کی مرضی کو دخل ہونا چاہیئے۔ امریکا اور برطانیہ کے رجحانات کا پرتو پڑا، تحریکیں چلیں، فلسفے بنے، کتابیں مرتب ہوئیں، انقلاب ہوا اور جمہوریت فرانس کی بنیاد پڑی۔ پھر تو رفتہ رفتہ یورپ کے بیشتر حصوں میں جمہوریت کی دھوم مچ گئی۔

ہندوستان میں برطانوی حکومت تھی۔ پہلا مقابلہ برطانیہ کا ہندوستانی عوام سے اس بنا پر ہوا کہ عوام کی وفاداری ہندوستان کے راجوں اور نوابوں سے وابستہ تھی۔ وہ بدیسی اور نصرانی حکومت کے وفادار بن کر رہنا نہیں چاہتے تھے اس معرکہ میں عوام کو شکست ہوئی۔ برطانیہ نے ملک میں انگریزی تعلیم کو رواج دیا۔ کیوں؟ اس بڑی سلطنت کو چلانے کے لئے! برطانیہ سے ضروری تعداد میں کارکن نہیں آسکتے تھے۔ اسی ملک میں لوگوں کو کلرک بنانے کے لئے انگریزی تعلیم ضروری تھی۔ مسلمانوں نے کم اور ہندوؤں نے زیادہ اس نظام تعلیم کو قبول کیا۔ ہندوؤں نے زیادہ اس لئے کہ خود انگریزوں کی کوشش بھی رہی کہ کیونکہ مسلمانوں پر ان کو زیادہ بھروسہ نہ تھا۔ لیکن تقسیم بنگالہ کا واقعہ پیش آیا تو ہندوؤں میں برطانیہ

کے خلاف ناراضی پیدا ہوئی۔ یہی زمانہ تھا اور یہی ناراضی وجہ تھی کہ یورپ کے انقلابی لٹریچر کی ملک میں درآمد شروع ہوئی اور اس کی مقبولیت بڑھی اور ملک نظریاتی طور پر یورپی جمہوریت سے آشنا ہوا۔

مسلمانوں میں جو انگریزی پڑھ رہے تھے، ان کی جنگ علماء سے تھی۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ علماء نے انگریزی تعلیم کی مخالفت کر کے مسلمانوں کو ہندوؤں سے پیچھے کر دیا ہے۔ ان کی ساری توجہ علماء کی مخالفت میں لگ گئی اور یہ سوچ کر کہ ان کو زیادہ سے زیادہ انگریزی حکومت کے پرزے بننا ہے، اور ہندوؤں کا اس میدان میں مقابلہ کرنا ہے، انہوں نے یورپ کے انقلابی لٹریچر اور اس کے جمہوری نظریہ کو سمجھنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ خلافت تحریک سے یہ طبقہ متاثر تو ہوا لیکن انگریزوں کی مخالفت میں زیادہ آگے بڑھنا اس طبقہ کے لئے ممکن نہ ہو سکا۔ اس نے سوچا وہ انگریزی تعلیم میں پیچھے ہو ہی گیا ہے اور زیادہ پیچھے ہو جائے گا۔ ہندو مسلم نزاعات اور خود ترکی میں خلافت کے الغاء کا اثر بھی پڑا۔ ان میں کچھ لوگ تھے جو ہندوؤں کے شانہ بشانہ مخالف برطانیہ تحریک میں آگے بڑھے اور بڑھتے رہے۔ لیکن ان کی تعداد کم تھی

مسلمان جدید انگریزی تعلیم میں اس غرور کی وجہ سے پیچھے ہو گئے تھے جو حکومت کرنے کی وجہ سے ان میں پیدا ہو گیا تھا۔ اور جس غرور کو برابر بڑھاوا مل رہا تھا۔ انگریزی تعلیم چونکہ کلرک بنانے کے لئے دی جاتی تھی اور گراں خرچ بھی تھی، اس لئے اس میں زیادہ کشش نہیں تھی۔ صرف زمین داروں اور رئیسوں کے بچے ہی پڑھ سکتے تھے۔ اور ان کو اپنا اقتدار باقی رکھنے کے لئے اونچی نوکریوں کی ضرورت بھی تھی۔

علماءِ دین برطانوی اقتدار کو مذہب کے لئے خطرہ سمجھتے تھے۔ پھر عالم اسلام کی پامالی بھی برطانیہ اور اس کے حلیف ملکوں کے ذریعہ ہوئی تھی۔ ان کی معاشی حالت بھی اعلیٰ انگریزی تعلیم کے اخراجات کے بوجھ کو برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ انگریزوں کا مذہبی نظام (چرچ) بھی علماء کے اثر کو ختم کرنے کی کوششیں کرتا رہتا تھا اس لئے وہ

ہر طرح پر اس غیر ملکی حکومت کو اکھاڑ پھینکنے کے حق میں تھے۔ حکومت سے ان کا معمولی تصادم بھی ہوا اور جب ہندوؤں کی ایک جماعت ان کو مل گئی جو انہیں اجنبی حکومت سے ملک کو پاک کرنا چاہتی تھی تو یہ اس جماعت کی حمایت میں کھڑے ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ علماء کا طبقہ شروع سے کانگریس کا حامی رہا۔

یورپ کا جمہوری نظریہ ملک میں پھیلا تو ان کو اچنبھا نہیں ہوا۔ یہ ان کے لئے اجنبی چیز نہ تھی۔ تفصیلات میں تو بہت باتیں اسلام کے مطابق نہیں تھیں لیکن اصول میں کوئی فرق نہ تھا۔ یہ صحیح ہے کہ کتاب وسنت میں کوئی ایسی نص نہیں ہے جس سے جمہوری حکومت کے قیام کا حکم ملتا ہو لیکن اسلام نے جس طرح کا سماج بنایا، اپنے ماننے والوں کا جو مزاج تیار کیا وہ ایسا ہی تھا کہ سوائے جمہوری حکومت کے کوئی دوسری حکومت نظریاتی اعتبار سے اہل اسلام کے لئے قابلِ قبول نہیں ہو سکتی تھی۔ مسلمانوں کی معاشرت میں مساوات کو جو دخل ہے اور ان کی عبادت جس طرح کی اجتماعی ہے اور خلفائے راشدین اللہ کے سامنے اپنے کو جوابدہ سمجھتے ہوئے جس طرح عوام کے سامنے بھی اپنے کو جوابدہ سمجھتے تھے اور لوگوں کے اعتراضات کو خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کرتے اور ان کا جواب دیتے تھے اور جس طرح حضرت علی نے جنگ صفین میں اپنی رائے کے خلاف جمہور سپاہیوں کی ضد کو قبول کیا تھا اور ان خلفاء کے انتخابات اور ان کی نامزدگی جس طرح عمل میں آئی تھی، ان کو دیکھتے ہوئے فیصلہ یہی کرنا پڑتا ہے کہ جمہوری نظام شاہی کے مقابلہ میں اسلام سے قریب تر ہے اور یورپ نے تاریخ کے کسی نہ کسی مرحلہ میں اسلام کا اثر ضرور قبول کیا تھا۔ اس لئے مسلمانوں کے حریت پسند عناصر نے بالخصوص علماء کے طبقہ نے بلا تکلف جمہوریت کا نظریہ قبول کر لیا۔

ہندوستان آزاد اس حال میں ہوا کہ مسلمانوں کا حریت پسند عنصر مسلمانوں میں مقبول نہ تھا اور ہندوؤں کا حریت پسند عنصر ہندو عوام میں مقبول تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دستور ساز اسمبلی میں قوم پرور ہندوؤں کے جو رجحانات تھے ان کا اثر تو پورا

پڑا اور آزادی پسند مسلمانوں کے رجحانات کا اثر بہت کم پڑا۔

قوم پرور ہندو، ہندو تہذیب کی کمزوریوں سے واقف تھے جو اس مذہب میں کٹنگی کی وجہ سے پیدا ہو گئی تھی۔ وہ کمزوریاں اتنی زیادہ تھیں کہ ان کو وہ برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ گذشتہ تاریخ میں ہندو مصلحین بھی اپنی کوششوں میں کامیاب نہیں ہوئے تھے اس لئے ان قوم پرور ہندوؤں نے لامذہب (سیکولر) حکومت کی بنیاد رکھی ہندو مذہب کی وہ تمام باتیں جو مغربی تہذیب میں بھی ملتی تھیں، ان کی تو انہوں نے ہمت افزائی کی جیسے ناچ گانا، بے پردگی، صنم تراشی اور مصوری، اور ہندو مذہب کی جن باتوں کا یورپ میں وجود نہیں تھا ان کو انہوں نے مٹایا جیسے عورتوں کو انہوں نے وہ حقوق دیئے جو ہندو شاستر میں نہیں تھے اور عورتوں کو سرکاری ملازمتوں اور عہدوں پر فائز کیا۔ چھوت چھات کو جرم قرار دیا، بین القبائلی شادیوں کی حمایت کی اور جب یہ کہا گیا کہ یہ ہندو شاستر کے خلاف ہے تو انہوں نے جواب دیا کہ یہاں حکومت لادینی ہے۔ وہ شاستر اور فقہ کی پابند نہیں۔ اس رو میں ایسے قوانین بھی بنے جو مسلمانوں پر بھی لاگو ہوتے تھے اور وہ اسلام کے خلاف تھے۔

ہندوستان کی طرح اور بہت سے ملکوں میں جمہوری نظام ہے لیکن ہر جگہ ایک طرح کا نظام نہیں ہے۔ انسان کی خوبیاں اور خامیاں دونوں ان نظاموں میں جھلکتی ہیں۔ حقیقت میں کوئی نظام بھی اپنے دعویٰ کے مطابق نہیں ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔

دعویٰ یہ ہے کہ عوام کی فلاح کے لئے عوام کی حکومت ہو جسے عوام ہی چلائیں۔ اس کے لئے انتخابات کو بنیاد بنایا گیا ہے تاکہ عوام کی متفقہ رضامندی حاصل نہ ہو تو کم از کم اکثریت کی رضامندی تو حاصل ہو جائے، لیکن یہ کوشش کسی ملک میں بھی کامیاب نہیں ہوئی ہے۔ جن کو انتخابات کا تجربہ ہے وہ جانتے ہیں کہ کوئی نمائندہ بھی اکثریت کا اعتماد حاصل نہیں کرتا ہے۔ مثلاً کسی علاقہ کے سَو ووٹ ہیں تو سب کے سب ووٹ دینے نہیں جاتے ہیں۔ مان لیجئے پچاس ووٹ

پڑے۔ ایک نمائندہ کو ۲۶، دوسرے کو ۲۴ ووٹ ملے۔ ۲۶ والا کامیاب ہوا۔ حالانکہ اس کو سو میں ۲۶ ووٹ ملے تھے۔ وہ اکثریت کے ووٹ سے محروم رہا۔ اگر کئی امیدوار ہوتے تو کامیاب امیدوار کو اور بھی کم ووٹ ملتے۔

ہندوستان میں مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ نے انڈی پنڈنٹ پارٹی بنا کر اور انتخابات میں لڑ کر اندازہ کیا کہ کوئی نمائندہ اکثریت کا اعتماد حاصل نہیں کر سکتا۔ انہوں نے اپنی کتاب حکومت الٰہی میں جمہوریت کی اس خرابی پر روشنی ڈالی ہے اور وہ ہندوستان میں پہلے آدمی ہیں جنہوں نے طریق انتخاب کی خامیوں کو اس تفصیل سے بتایا ہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر محمود نے، جو مختلف وزارت کے عہدوں پر فائز رہے، اپنے بیان میں کہا کہ طریق انتخاب پر نظر ثانی ہونی چاہئے۔ آخر میں ونوبا بھاوے اور جے پرکاش نرائن نے بھی انتخابات پر تنقیدیں کیں۔

اس ایک نقص کے علاوہ اور بھی نقائص ہیں جو موجودہ جمہوری نظام میں ہم پاتے ہیں۔ اور ہم اس وقت تک ان نقصانات سے بچ نہیں سکتے جبتک کہ حکمراں طبقہ نہ صرف عوام کے سامنے اپنے کو جوابدہ سمجھے بلکہ اللہ کے سامنے بھی اپنے کو جوابدہ سمجھے اور اس کا خوف اور آخرت کا یقین ہر دل میں سما جائے اس کے لئے تمام منصوبوں کے ساتھ ایمان اور عمل صالح کا منصوبہ بھی بننا چاہئے۔

ہماری سب سے بڑی بدبختی یہ ہے کہ اسکولوں اور کالجوں میں اس طرح کا کوئی نصاب نہیں اور لڑکے تہذیب و شائستگی اور ایمان سے بے بہرہ ہیں۔

نظام حکومت کا نقص اور معاشرتی نظام کا نقص اس وقت تک باقی رہے گا جب تک خدا پر یقین اور آخرت کی جوابدہی کا تصور پیدا نہ ہوگا۔ اس نقص کو مسلمان دور کر سکتے ہیں لیکن مسلمانوں کے یہاں دین کا صرف تہذیبی تصور باقی رہ گیا ہے دین کا اخروی تصور جو حقیقی تصور ہے گم ہو گیا ہے۔ چنانچہ اپنی تاریخ پر فخر، اپنی قومیت پر فخر، اپنی تہذیب پر فخر اور اپنے اسلاف پر فخر — یہ سارے مفاخر مسلمانوں کے یہاں موجود ہیں لیکن آخرت کا خیال، اپنے انجام کا خوف، اور آخرت پر یقین کی بنیاد

پر دنیا میں اخلاق و شرافت اور بلند کرداری کا ثبوت، یہ باتیں ختم ہو چکی ہیں۔ مسلمان اپنی متاعِ گم شدہ کو حاصل کریں گے تو اس ملک کی رہنمائی کر سکیں گے۔

نسلی امتیاز اور غرور

ہندوستان میں نسلی امتیاز کی جو تحریک برہمنوں نے صدیوں سے چلا رکھی تھی اس نے مسلم دشمنی کی شکل اختیار کر لی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کے دو ٹکڑے ہوئے لاکھوں ہندو مسلمانوں کو ترک وطن کرنا پڑا اور ان گنت ہندو مسلمانوں کی جان گئی۔ پھر بھی نسلی امتیاز کے حامیوں کو اطمینان نہیں ہوا۔ وہ یہ چرچا کر رہے ہیں کہ ہندوستان صرف ہندوؤں کا ہے۔ دوسری ملت کے لوگ اجنبی ہیں اور ان کو غیر ملکی بن کر رہنا چاہئے یا ملک چھوڑ دینا چاہئے۔ اس نعرہ نے مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی، ہریجن سبھوں کو دکھ میں ڈال دیا ہے۔ ہندوؤں اور برہمنوں میں جو محبّ وطن ہیں، خوف کھا رہے ہیں کہ ملک تباہ نہ ہو جائے کیونکہ اس طرح کا نعرہ ہٹلر نے یورپ میں لگایا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہٹلر کی قوم جرمن جو دنیا کی ذہین ترین قوم ہے اور سب سے زیادہ محنتی اور ہنرمند ہے، تباہ ہو گئی۔ اگر روس اور امریکہ میں چشمک پیدا نہ ہو جاتی تو یہ قوم برسوں پنپ نہیں سکتی تھی۔ اس ذہنیت کو، جسے آر ایس ایس نے ہوا دی ہے بدلنے کی کوشش ہر محب وطن کو کرنی چاہئے۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ پوری قوت سے اس کی کوشش نہیں ہو رہی ہے اور پریس اور مختلف پلیٹ فارم سے اقلیت دشمنی اور ہندو سامراج کا پروپیگنڈہ ہوتا رہتا ہے اور خطرہ پیدا ہو گیا ہے کہ ملک کا کوئی حصہ پھر الگ نہ ہو جائے۔ جنوبی ہند میں "دراوڑ ستان" کی تحریک زور پکڑ رہی ہے۔ ان کے حامی سیاسی، علمی اور مالی لحاظ سے طاقتور بن گئے ہیں۔ اور مدراس میں اس تحریک کے خلاف بولنا آسان نہیں رہا ہے۔ وہاں راون کی تعریفیں کی جاتی ہیں اور رام کے پتلے جلائے جاتے ہیں۔ ہندوؤں کی عظیم

شخصیتوں کو برا کہا اور لکھا جارہا ہے۔ راجا جی آنجہانی وغیرہ کچھ مدبروں نے صورت حال کو بھانپا اور حکومت ہند کی پالیسی میں بعض تبدیلیوں کے خواہاں ہوئے۔ یہ ٹھیک ہے کہ دراوڑ اپنا علیحدہ وطن بنانے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ یہ کام پاکستان بنانے سے زیادہ مشکل ہے۔ کیونکہ کوئی تیسری طاقت اب ملک میں نہیں جس کے ہاتھوں میں فیصلہ ہو۔ ہندو اور حکومت ہند دونوں آج بہت زیادہ طاقتور ہیں لیکن ظلم اور غلط فیصلہ بڑی بڑی طاقتوں کو کمزور کر دیتے ہیں۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہماری حکومت ظلم کو روکنے میں مستعد نہیں۔ نسلی امتیاز و برتری کی تحریک نے جو ظلم ڈھا رکھا ہے اس کو نہیں روک رہی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس نے مسلم، ہندو، سکھ، عیسائی، پارسی، سبھوں کو حکومت میں شریک کیا اور سبھوں کی مدد سے حکومت چلا رہی ہے لیکن نسلی امتیاز کی ذہنیت پوری قوت کے ساتھ ملک میں موجود ہے اس ذہنیت کو بہادری کے ساتھ چیلنج نہیں کیا جارہا ہے۔ مسلمان زیادہ اور ہریجن کم لوٹے اور قتل کئے جاتے ہیں ذرائع معاش مسلمانوں پر کشادہ نہیں ہیں۔ خوف اور بے اطمینانی پھیل رہی ہے۔

ہم اس نازک صورتحال میں ان مجنونوں کو تلاش کرتے ہیں خواہ وہ ہندوؤں میں ہوں یا مسلمانوں میں یا کسی اور اقلیت میں جو نسلی امتیاز اور غرور کے خلاف پر امن جنگ کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوں۔ اللہ کے ایسے بندے موجود ہیں کیا وہ منظم ہو کر آگے نہیں بڑھ سکتے۔

دین و سیاست کے حدود

ایک زمانہ تھا کہ مذہب زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی تھا۔ جو حکومت کا کام کاج چلاتے تھے، چونکہ وہ ہمیشہ مذہبی نہیں ہوتے تھے اور مذہب کی گرفت سے آزاد بھی رہنا چاہتے تھے، اس لئے ان کے ذمہ ملک فتح کرنا اور رعایا کی جان مال اور آبرو کی حفاظت ہی کے کام ہوا کرتے تھے اور انکو اس بات کا اختیار نہ تھا کہ زندگی کے دوسرے شعبوں میں دخل دیں۔ یہ بات جانی بوجھی تھی۔ حکومت کا کام کاج کرنیوالے بھی اور عام باشندے بھی یہ سب ہی مانتے تھے۔ ایسی حکومت کو اچھا سمجھا جاتا تھا جو مذہبی مسائل میں کم سے کم دخل دے۔ رفتہ رفتہ سیاست کے حدود و اختیارات بڑھتے

گئے۔ اب حال یہ ہے کہ زندگی کے تمام شعبوں پر سیاست حاوی ہے۔ لوگوں میں یہ خیال پیدا ہوگیا کہ عوام از خود اپنے مسائل حل نہیں کر سکتے۔ ان کے تمام مسائل کو حل کرنے کی ذمہ داری حکومت پر ہے۔ خود ہماری حکومت باشندگانِ ملک کے سب ہی کاموں کی ذمہ دار ہے۔ اس طرح جو حکومت سیکولر تھی یعنی مذہبی پابندیوں سے آزاد تھی وہ ویلفیر اسٹیٹ بھی ہوگئی یعنی عوام کے فلاح و بہبود کے تمام ذمہ داری اس نے اپنے اوپر لے لی۔ اس طرح حکومت اور مذہب میں کشمکش پیدا ہوگئی ہے۔ وقت آگیا ہے کہ ہم اس بارے میں خوب سوچ کر کوئی فیصلہ کریں اور غیر شعوری طور پر حالات کے بہاؤ کا شکار نہ ہو جائیں۔

حکومت کے ہاتھوں میں زندگی کے تمام کام ہوں، عام طور پر اس کو لوگ پسند کرتے ہیں خواہ وہ حکومت نمائندہ حکومت کہلاتی ہو یا غلامی کی کوئی خوفناک شکل ہو۔ کہتے ہیں اس زمانہ میں ایسا ہی ہونا چاہیئے۔ لیکن کچھ سلجھے ہوئے دماغ ہیں جو دوسری طرح بھی سوچتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ سب کام حکومت کے حوالہ نہیں کرنا چاہیئے۔ ونوبا جی کا ایک مضمون بھودان تحریک میں یکم ستمبر ۵۷ء میں شائع ہوا ہے اس میں وہ فرماتے ہیں:

> آج تمام ملکوں میں سرکاری اقتدار ہے۔ وہ چنی ہوئی سرکار ہے لیکن کام جن شکتی سے نہیں ہوتا۔ وہ نمائندہ عوام شاہی ہے یعنی خدمت کا سارا کام ہم نے نمائندوں کے سپرد کر دیا ہے۔ اپنے سارے کام ہم نمائندوں پر چھوڑ دیں تو ہم بے طاقت ہو جائینگے پھر تو ہمیں عقل کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ ہم نے نوکر چنے ہیں (ممبران اسمبلی) لیکن وہی اصل مالک بن گئے ہیں اور عوام برائے نام مالک ہیں وہ تو بالکل غلام بن گئے ہیں۔ آج امریکا کا تمام اقتدار "آشک" اور اس کے چند آدمیوں کے ہاتھ میں ہے وہ چاہیں تو ملک اور دنیا میں آگ لگا سکتے ہیں اگر ان کی عقل غلط سمت گئی۔ اتنی بھیانک طاقت

ہم نے نمائندوں کے ہاتھوں میں دے دی ہے۔ ہماری پوری زندگی پر ہمارا قابو نہیں رہا ہے۔ شادی کا قانون، تعلیم کا قانون، زمین کا قانون، بیوپار کا قانون، کون سا قانون سرکار نہیں بنا سکتی۔ حد درجہ بھیانک صورتحال ہے صرف اس ملک کی ہی نہیں، ساری دنیا کی۔"

ونوبا جی سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے آگے لکھتے ہیں:

"اس لئے نمائندوں سے جو کام چلتا ہے اس نے ہمیں حقیر بنا دیا ہے اور اپنی زندگی کے جو اہم کام ہیں انہیں اپنی طاقت سے جنتا کو کرنا ہے۔"

اسی غرض سے بھودان تحریک چلائی جا رہی ہے۔ بھودان تحریک سے یہ نقص دور ہو سکے گا جس کی طرف ونوبا جی نے اشارہ کیا ہے، اس میں ہمیں شبہہ ہے لیکن اتنے عمومی اختیارات حکومت کو سونپ دینا قابلِ غور ضرور ہے۔ حکومت اپنے بنیادی فریضہ (لوگوں کے جان و مال کی حفاظت) کو تو پورا کر ہی نہیں سکتی، اتنے سارے کام کیسے کر سکتی ہے؟ جو اس نے اپنے ذمہ لئے ہیں۔ مذہب کی ہمہ گیری ہمیں منظور ہے کیونکہ مذہب کہاں تک نفع بخش ہے، اس کا ہمیں تجربہ ہے لیکن حکومت جو ہمیشہ بدلتی رہتی ہے اور جس کا قانون بھی بدلتا رہتا ہے، اس پر ہم اعتبار کیسے کریں؟ اس کا تو یہی کام برابر رہے گا تجربہ کرو اور بدلو تجربہ کرو اور بدلو۔

بہار میں ایک حکومت نے انگریزی میں کامیاب ہونا میٹرک کے لئے ضروری نہیں سمجھا۔ دوسری حکومت آئی تو اس نے ضروری کر دیا۔ یہی حال حساب کا ہوا۔ میٹرک کے لئے حساب لازمی مضمون نہیں ہوا تھا، پھر دوسری حکومت آئی اس نے لازم کر دیا۔ اس طرح قانون بدلتے رہتے ہیں اور بدلتے رہیں گے۔ اور یہ سب کام ہمارے نمائندوں کے ذریعہ ہوگا۔ ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں،

اپنے کو دے دینا جن کے کسی کام میں ٹھیراؤ نہیں ہے، جو روز تبدیلیاں کرتے رہتے ہیں، سمجھداری کی بات نہیں ہوگی۔

ہندوستان کا جو دستور بنا، ہمارا خیال ہے کہ مذہبی گروہ نے دستور بنانے والوں پر اعتماد کیا اور دستور کو سمجھ کر نہیں قبول کیا۔ جن لوگوں نے دستور بنایا انہوں نے بھی جلدی میں دستور بنایا۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں بار بار ترمیمیں ہوتی رہتی ہیں۔ جن لوگوں نے دستور کو محض اعتماد کی بنیاد پر قبول کیا ہے ان کو چاہیئے کہ سوچیں کہ ملک کے لئے فلاحی ریاست ملک کی روایات کے مطابق ہے یا نہیں۔ ہم اس بارے میں اپنا کوئی فیصلہ نہیں دیتے لیکن جو چیز کھٹکتی ہے اس کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ مذہبی جماعتوں کو مل کر چاہیئے کہ موجودہ دستور پر غور و بحث کر کے اگر کوئی نقص پائیں تو اسے ملک کے سامنے رکھیں ہم ونوباجی کو قابل مبارکباد سمجھتے ہیں کہ انہوں نے دستور کے بنیادی نقص کی طرف توجہ کی ہے۔

اس طرح کا کوئی مشورہ اگر ہم نے ملک کو دیا تو یہ ملک ہی کی رہنمائی نہ ہوگی بلکہ اس سے ساری دنیا کو رہنمائی ملے گی کیونکہ آج ساری دنیا دکھی ہے۔ ہر جگہ لوگ اندرون ملک میں بھی جان و مال کو محفوظ نہیں پاتے حالانکہ منظم حکومت موجود ہے اور اس پر عوام کا یہ بنیادی حق ہے کہ وہ حفاظت کرے۔ صرف سعودی عرب وہ واحد ملک ہے جہاں اندرون ملک میں مکمل امن و امان ہے۔ دوسرے ملکوں میں ملکوں ملکوں کے درمیان کشیدگی ہے۔ شاید اسکی وجہ وہی ہو کہ ہم نے سارا اختیار "اٹیک" کے حوالے کر دیا ہے۔ ہم کو یہ فیصلہ کرنا ہے کہ ہم مذہب کے مفہوم کو محدود کر دیں جیسا کہ سیکولر اسٹیٹ کے حامیوں کی خواہش ہے یا حکومت کے اختیارات محدود کر دیں۔ یا تو حکومت مذہبی اور ویلفیر اسٹیٹ ہو یا سیکولر اسٹیٹ ہو اور ویلفیر اسٹیٹ نہ ہو اور سارا اختیار فرد کے ہاتھوں میں ہو۔

جہاد کی ترغیب

وزیر محکمہ پولیس مسٹر چرن سنگھ نے کہا کہ ہندوستان کی نصف درجن مسلم جماعتیں مسلمانوں میں علیحدگی پسندی کے جراثیم پھیلانے کی ذمہ دار ہیں۔ انہوں نے اس حقیقت کو پیش نظر نہیں رکھا کہ مسلمانوں کی متعدد جماعتیں مسلمانوں کو قومی دھارے میں شرکت کی ترغیب بھی دیتی رہی ہیں اور خود قومی دھارے میں شریک ہیں۔ آزادی کی لڑائی میں مسلمانوں نے زبردست حصہ لیا ہے۔

غالباً یہ الزام انہوں نے ان ہندوؤں کی فرقہ پرستی پر پردہ ڈالنے کے لئے لگایا ہے جو مسلمانوں سے چھوت چھات کرتے ہیں اور جو سرکلر بھیجتے ہیں کہ فوج میں مسلمانوں کو نہ لیا جائے اور جو مسلمانوں کو سرکاری نوکریوں میں نہیں آنے دیتے اور جو نہیں چاہتے ہیں کہ مسلمان اچھوتوں میں کام کریں۔

چرن سنگھ نے ایک بیان میں یہ بھی کہا ہے کہ جمعیۃ علماء مسلمانوں میں جہاد کی ترغیب دیتی ہے۔ یہ بھی چرن سنگھ کی بھول ہے۔ جمعیۃ علماء جہاد کی ترغیب نہیں دیتی بلکہ جہاد کی ترغیب فرقہ پرست ہندو دے رہے ہیں، اور ریاستوں کی کانگریسی حکومتیں دے رہی ہیں۔ جب کانگریسی حکومتیں مسلمانوں کی حفاظت نہ کرسکیں اور جب فرقہ پرست ہندو مسلمانوں کی زندگی حرام کردیں ان کی جان لیں، ان کا مال لوٹیں، مکانوں اور دکانوں کو نذر آتش کردیں، ان کی عبادت گاہیں قبضہ میں کرلیں، ان کے خلاف دلآزارانہ باتیں کہیں اور لکھیں، تو بتائیے مسلمان جہاد کے سوا اور کیا سوچے گا۔ حاشا و کلا کسی مسلم جماعت کو اس کی فکر نہیں کرنی چاہیے کہ مسلمان جہاد کریں۔ جب بلی کتے کے قابو میں ہوتی ہے اور کوئی مفر نہیں پاتی ہے تو وہ اپنے تیز ناخن کو حرکت دیتی ہے اور کتے کو نوچتی ہے۔

[1] قارئین پر یہ واضح رہے کہ یہ تحریر اس وقت کی ہے جب چرن سنگھ یوپی کے صرف وزیر تھے۔

ابھی تو مسلمان واعفوا واصفحوا (معاف کرو اور چھوڑ دو) پر عمل کر رہے ہیں اور دکھے ہوئے دلوں کے ساتھ ان الزامات کو سنتے ہیں جو زیر موصوف کے قسم کے لوگ مسلمانوں پر لگاتے ہیں لیکن آخر تو کبھی صبر کا پیمانہ چھلکے گا اور وہ جو ہر ظالم کے مقابلہ میں مظلوم کی مدد کرتا ہے، پکارے گا:

جاھدوا فی اللہ حق جھادہ	جہاد کرو اللہ کی راہ میں جس طرح جہاد کرنے کا حق ہے۔

اور پھر اس طرح ہمت بڑھائے گا:

کم من فئۃٍ قلیلۃ غلبت فئۃ کثیرۃٍ باذن اللہ۔	کتنی ہی چھوٹی تعداد والے بڑی تعداد والوں پر غالب آجاتے ہیں۔ اللہ کے حکم سے۔

ہم اعلان کرتے ہیں کہ ہم جمہوریت اور انفرادی آزادی کے بنیاد پر برادران وطن کے ساتھ شانہ سے شانہ ملا کر اپنے ملک کو ترقی دینے کی جدوجہد میں کارنمایاں انجام دینا چاہتے ہیں۔ ہم ہندوستان کے ہر فرد کو اپنا بھائی سمجھتے ہیں لیکن ہمارا بھائی ہم پر ظلم کرے تو اسے برداشت کرنے کی ایک حد ہوگی ہمیشہ ظلم برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ اگر مسلمانوں میں ظلم روکنے کی طاقت نہیں ہوگی تو احکم الحاکمین کے عذاب سے ظالموں کو کوئی طاقت بچا نہیں سکے گی۔

بترس از آہِ مظلوماں کہ ہنگامِ دعا کردن
اجابت از درِ حق بہرِ استقبال می آید

ہم ہندوؤں کے صالح عناصر سے عرض کریں گے کہ وہ ظالم اور مظلوم کو ایک سطح پر نہ رکھیں۔ ترازو کے پلڑے برابر کرنے کے لئے مظلوم فرقہ پر خواہ مخواہ کے الزامات عائد نہ کریں۔ دنیا اسے فرقہ پرست ہندوؤں کے جارحانہ رویہ کے لئے حسن تعلیل ہی سمجھے گی۔ مسلمانوں میں جہاد کی اور علیحدگی پسندی کی ترغیب کوئی مسلم جماعت نہیں دے رہی ہے۔ ہندوؤں کے صالح عناصر کو چاہئے کہ

وہ بہادری سے فرقہ پرست ہندوؤں کا مقابلہ کریں جس طرح فرقہ پرست مسلمانوں کا مقابلہ مسلمان محبان وطن نے کیا تھا۔ ہاں، وہ کامیاب نہیں ہوئے لیکن ؎

سودا قمارِ عشق میں خسرو سے کوہکن
بازی اگرچہ لے نہ سکا سر تو دے سکا
کس منہ سے اپنے آپ کو کہتا ہے عشق باز
اے روسیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

مسلمان محبانِ زادی کی شکست سے یہ نہ سمجھے کہ قوم پرور ہندوؤں کو بھی شکست ہوگی۔ حالات بدلے ہوئے ہیں۔ مسلمان محبان آزادی کمزور تھے بے اختیار تھے اور قوم پرور ہندو طاقتور اور با اختیار ہیں۔ محبان وطن مسلمانوں کی حکومت نہ تھی بلکہ انگریزوں کی حکومت تھی جو دشمن تھے۔ اور محبان وطن ہندوؤں کی حکومت ہے۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ وہ اپنوں پر سختی کرنے سے کتراتے ہیں اور گھبراتے ہیں۔

پرکھوں کی باتیں

یوپی کے وزیر اعلیٰ سمپورنانند جی نے فرمایا کہ مسلمان یہاں کے پرکھوں کی اولاد ہیں۔ ہر قوم اپنے باپ دادا کے کارناموں پر فخر کرتی ہے لیکن مسلمان اپنے پرکھوں پر فخر نہیں کرتے جن کی اولاد سے وہ ہیں۔

یہ تو صحیح ہے کہ ہم مسلمان اکثر و بیشتر یہاں کے پرکھوں کی اولاد ہیں لیکن ہمارے ان پرکھوں نے ہمارے لئے کیا کیا ہے جو ہم ان کے کارناموں پر فخر کریں۔ انہوں نے ہمیں ایک دوسرے سے نفرت و عداوت سکھائی، ہمیں شدر اور راکشش کہا، ہمیں اچھوت سمجھا، ہمارا چھوا کھانا نہیں کھایا، ہمارے چھوئے ہوئے برتنوں میں پانی نہیں پیا، شرک، بت پرستی اور توہم پرستی سکھائی۔ رامائن میں ہم پڑھتے ہیں کہ

راون سیتا کو لے گیا تو اس کی سزا صرف راون کو نہیں ملی بلکہ اس سزا میں سارے لنکا کو جلا دیا گیا۔ چنانچہ اس کو بار بار پڑھنے کا اثر یہ ہے کہ کسی مسلمان کا کوئی فرضی جرم مشتہر کر کے پوری مسلم قوم کو سزا دی جاتی ہے۔ ان کی جان لی جاتی ہے، ان کا مال لوٹا جاتا ہے، ان کی دوکانوں اور گھروں میں آگ لگائی جاتی ہے، ان کے بچوں کو قتل اور عورتوں کو بے عزت کیا جاتا ہے۔ نہ صرف یہ کہ ہمارے پرکھوں کا سلوک ہمارے ساتھ اچھا نہیں رہا بلکہ ان پرکھوں کی جو اولاد ہے ان کا سلوک بھی ہمارے ساتھ اچھا نہیں آخر ہم گاندھی جی جواہر لال پر فخر کرتے ہیں، ان پر فخر کیوں نہ کرتے۔ ہاں ہم فخر کرتے ہیں اسلام پر، اسلام کے اکابر پر جنہوں نے ہمیں غلامی سے آزاد کیا، ہم میں بھائی چارگی اور برابری پیدا کی، ہمارا نام مسلمان رکھا یعنی اللہ کا فرمانبردار، راجے مہاراجوں کا فرمانبردار نہیں۔ ہمیں شرک، بت پرستی اور وہم پرستی سے بچایا۔ انہوں نے ہندوستان میں غلاموں کی حکومت قائم کر کے یہ نظیر قائم کر دی کہ حکومت اور بادشاہی کسی ذات کے لئے مخصوص نہیں ہے بلکہ جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے۔ ہر شخص کو حکومت کرنے کا حق ہے۔

اگر یوپی کے سابق وزیر اعلیٰ شری سمپورنانند جی چاہتے ہیں کہ آنے والی نسلیں ان پرکھوں کی عزت کریں تو وہ اپنے دل سے نفرت و عداوت کی آگ بجھائیں اور محبت والفت کا نغمہ ساری قوم ہندوستان کو سنائیں ورنہ پرکھوں کے کارناموں پر فخر کرنے کا مطالبہ بے سبب ہوگا۔

مسلمان ہندو نہیں ہو سکتے

معاصر الجمعیۃ نے اپنے اداریہ میں معاصر پرتاپ کی حسب ذیل سطریں قلمبند کی ہیں:-

"یہ فرقہ وارانہ گڑبڑ آج ختم ہو سکتی ہے، اگر مسلمان یہ سمجھنا شروع کر دیں

کہ یہ ہندو ہی کی اولاد ہیں اور ان کی رگوں میں ہندو خون دوڑ رہا ہے، ان کی نشو و نما ہندوستانی ماحول میں ہوئی ہے۔ ان کی روایات اور ان کی تہذیب ہندوستانی ہے۔ میں پوری طرح سمجھتا ہوں کہ کئی کانگریسی اور متعدد مسلمانوں کا دل یہ سطریں پڑھ کر بیٹھ جائے گا لیکن یقین کیجیئے کہ جب تک ان لائنوں پر چلنے کی کوشش نہ ہوگی، ہندو مسلم مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ کانگریس ہزار کوشش کرے، یہ تناؤ جاری رہے گا اور وقتاً فوقتاً پھوٹ پڑے گا۔ جب تک مسلمان ہندوستان کی حقیقی تہذیب کو اپنانے کے لئے تیار نہیں ہوتے، انہیں غیر سمجھا جائے گا۔

آخر مجھے یہ بتایا جائے کہ انڈونیشیا میں کیوں وہاں کے مسلمان اپنی پرانی تہذیب کو بھلانے کے لئے تیار نہیں ہوئے؟ کیا انڈونیشیا کے مسلمان رامائن اور مہابھارت کی پوجا نہیں کرتے؟ یہ کیا مذاق ہے کہ آج ہندوستان کے مسلمان رام اور کرشن کا نام لینے سے شرماتے ہیں؟ جب تک یہ غلط باتیں ہندوستانی مسلمانوں کے دماغ سے نہیں نکلیں گی، ان کا ہندوؤں سے ملاپ نہیں ہو سکتا۔"

معاصر الجمعیتہ نے اوپر کی سطریں اس لئے نقل کر دی ہیں کہ وجہ فساد پر روشنی پڑ جائے اور یہ معلوم ہو جائے کہ آخر مسلمانوں کو کیوں تنگ کیا جا رہا ہے۔ ان سطروں کو پڑھنے کے بعد کسی کو یہ شک نہیں رہے گا کہ مسلمانوں کو مار مار کر ہندو بنانے کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ کیا فرقہ پرست ہندو اس میں رائی برابر بھی کامیاب ہیں؟ ہندوستان کو آزاد ہوئے زمانہ ہوا، جب سے بڑے بڑے فسادات ہو رہے ہیں۔ مسلمانوں کی جان و مال، عزت و آبرو سب پر حملے ہیں۔ بڑے بڑے دولتمند مسلمان منٹوں میں غریب اور مفلس ہو جاتے ہیں۔ ان کی املاک میں آگ لگا دی جاتی ہے لیکن دنیا دیکھ رہی ہے کہ مسلمان نہ ہندو ہو جاتے ہیں اور نہ ہندوستان کو چھوڑ

رہے ہیں، وہ اب بھی مسلمان ہیں۔ ان کی مسجدیں آباد ہیں، ان کے مذہبی مدارس چل رہے ہیں، ان کی دکانیں کھلی ہوئی ہیں۔ ان میں دیندار بھی ہیں، بے دین بھی ہیں لیکن کہتے سب اپنے کو مسلمان ہی ہیں۔ ہندو اپنے کو کوئی نہیں کہتا۔ وہ ہندوستان کے پرکھوں پر فخر نہیں کرتا۔ وہ رام اور کرشن کو نہیں مانتا۔ وہ رامائن اور مہابھارت کی پوجا نہیں کرتا یہ اس لئے کہ ماننے کا تعلق دل سے ہے۔ اذیت پہنچا کر نفرت پیدا کی جاسکتی ہے اپنی بات دلوں میں نہیں اتاری جاسکتی ہے۔ دلوں میں اتارنے کے لئے اچھی قدریں درکار ہیں۔ فرقہ پرست ہندوؤں کو سوچنا ہے کہ جو قدریں ان کے یہاں ہیں ان کی صحت پر خود ان کا یقین باقی رہا ہے؟ کیا چھوت چھات کو آج سب ہندو اچھا سمجھتے ہیں؟ کیا لڑکیوں کو ترکہ نہ دینے پر سب ہندوؤں کا اتفاق ہے؟ کیا بت پرستی کو سب ہندو قبول کرتے ہیں؟ کیا ہریجنوں کو ذلیل سمجھنے پر کسی کا دل ملامت نہیں کرتا ہے۔ رامائن اور مہابھارت سے جنگ کی جو فضا بنتی ہے کیا اس کے مقابلہ میں انہی ہندوؤں میں سے کچھ قابلِ قدر بزرگوں نے عدم تشدد اور اہنسا کا نظریہ نہیں پیش کیا؟ وضع قطع میں بھی دیکھئے، کتنا فرق آگیا ہے۔ آج کتنے ہندو ٹیک رکھتے ہیں؟ کتنے ہندو "پنچ گو" کھاتے ہیں؟ کتنے ہندو دھوتیاں پہنتے ہیں؟ آج سروں پر ٹیک نہیں ہے۔ دھوتی اور شلوار کی جگہ پتلون زیب تن ہے۔ جب خود ہندو اپنے مذہب اور اپنی تہذیب کو چھوڑ چکے اور چھوڑ رہے ہیں تو مسلمانوں سے کیا شکوہ؟ اور ان پر زور کیوں؟ یہ کیوں اس بات پر زور ہے کہ ہندو اپنے مذہب کو چھوڑ دیں، مسلمان ان کا مذہب اختیار کریں؟ یہ کیسے ممکن ہے جن کے مظالم سے تنگ آکر کسی نے جنگلوں کی راہ لی، کسی نے شدر بننے کی ذلت گوارہ کرلی، کسی نے مسلمان حملہ آوروں کو نجات دہندہ سمجھ کر اسلام قبول کرلیا، ان کے پرکھوں پر مسلمان فخر کیسے کریں۔ آج بھی لاکھوں کی تعداد میں ہریجن اور ڈراویڈین مسیحیت کے آغوش میں جارہے ہیں۔ ان کی اولاد کو ہندو بننے کے لئے کہئے گا تو وہ آپ کی دعوت کیسے قبول کریں گے۔ مسلمانوں کو تو چھوڑیئے، کیا جنوبی ہند

کے ڈراویڈ ہندو مذہب پر فخر کرتے ہیں؟ کیا وہ رامائن اور مہابھارت کو کوئی اچھی کتاب سمجھتے ہیں؟ کیا وہ رام اور کرشن کے عقیدت مند ہیں؟

مسلمانوں کے خلاف بھڑکا کر ہندوؤں کو ہندو کب تک رکھو گے؟ اسلام میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جو کیرکٹر ہے وہ من موہن ہے۔ جس شخص نے پڑھا اس کے دل میں حضور نے جگہ کی۔ اس کتاب کو آنکھوں سے لگا لیا جس میں اس فخر انسانیت کے حالات ہوتے ہیں۔ قرآن کیا ہے؟ موتی بکھرے ہوئے ہیں۔ ایسے احکام جو ہر زمانہ اور ہر ملک میں قابل عمل۔ کہیں کوئی دقت نہیں۔ سوائے فائدہ کے کوئی نقصان نہیں۔ پھر کیسے نہ اس کتاب کو مانیں اور کیسے نہ اس پر عمل کریں۔ اگر عادتیں بگڑ جاتی ہیں تو دل تو یہ کہتا ہے کہ بیشک اس میں ہمارے فائدہ کی باتیں ہیں۔ ہم فرقہ پرست ہندوؤں سے کہیں گے کہ تعصب و تنگ نظری برطرف، وہ قرآن کا مطالعہ کریں، اگر ان کو اس کی باتیں بھلی لگیں تو قبول کریں، نہ بھلی لگیں تو اپنے مذہب کو مضبوطی سے تھام لیں۔

اس جھوٹ سے کیا فائدہ کہ انڈونیشیا کے مسلمان رامائن اور مہابھارت کی پوجا کرتے ہیں۔ وہ ہندو کب تھے؟ وہ تو بدھ مذہب ماننے والے تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ ہندوستان میں بدھوں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں ہے۔ اس لئے ان کا دل چھوٹ گیا اور جب مسلمان آئے تو انڈونیشیا کے ان باشندوں نے اسلام قبول کر لیا۔

ہندوستان میں اچھے ہندوؤں کی کمی نہیں۔ انہیں چاہئے کہ فرقہ پرست ہندوؤں کو سمجھائیں کہ مسلمانوں کو اذیت دینے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا اور نہ دھمکیاں دینے کا۔ اچھے ہندوستانی کی طرح خود رہیں اور دوسروں کو رہنے دیں۔

اگر ابھی اور تجربہ کرنا ہے تو کچھ دن اور فسادات جاری رکھ لیجئے۔ سب دیکھیں گے کہ مسلمان اسی طرح مسلمان ہے۔ اس کے پائے ثبات میں لغزش نہیں۔ جو چاہے سزا دے دیجئے، جتنا چاہیں کھل کھیلئے۔ ٹھوکروں پر ٹھوکریں دیجئے لیکن وہ پہاڑ کی طرح

جما رہے گا۔ سر اٹھا کر چلے گا۔ اپنے سینے کشادہ رکھے گا۔ اپنے رسول کی تعلیم محبت کا پیغام
دیتا رہے گا۔

ہندوؤں سے خطاب

ہمارا ملک آزاد ہوا۔ ہم اپنے ملک کے حاکم اور مالک ہوئے۔ حاکموں کو راہ وسط
اختیار کرنی چاہیئے۔ عدل کا دامن زور سے تھامنا چاہیئے۔ جو حاکم محکوم پر ظلم کرتا ہے
اس کی حکومت چند روزہ ہوتی ہے۔ خلق اس وقت تک اطاعت کرتی ہے جبتک
اپنے کو مجبور پاتی ہے جس روز موقع پاتی راہ فرار اختیار کرتی ہے۔ فرار کی راہ نہیں پاتی
اور حاکم کسی گردش میں مبتلا ہوتا ہے تو دشمنوں سے جا ملتی ہے اور ان کو قوت
پہنچاتی ہے اور تخت حکومت پر لا بٹھاتی ہے۔ حاکم کی حکومت اس قوم کی
بدولت قائم ہے جو اس کی محکوم ہے۔ اس لئے اس قوم کی فلاح و بہبود جمہوری
ملکوں کا طریقہ ہے، وہاں اور زیادہ میانہ روی کی ضرورت ہے، ورنہ خانہ جنگی
اور زوال حکومت کو دعوت دیتا ہے۔

ہندوؤں میں جو لوگ دست ظلم دراز کرنے کے حامی ہیں انہیں اپنی
پوزیشن پر غور کرنا چاہیئے۔ کروڑوں مسلمانوں کی پاکستان میں سمائی نہیں ہو سکتی
یہ مسلمان ہندو بھی نہیں ہو سکتے۔ جب خود ہندوؤں کو اپنی تہذیب بدلنے
کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تو مسلمان کیوں کر ہندو ہوں گے۔ اس لئے اگر
ان کو وہ حق دیا جاتا ہے جو دستور میں ملا ہوا ہے تو وہ اسی طرح ہندوستان کے حاکم
ہیں جس طرح ہندو بھائی ہندوستان کے حاکم ہیں۔ دو بادشاہ اگر میانہ روی اور رواداری
اختیار نہ کریں تو دونوں میں جنگ ہوگی اور دشمنوں کو، جو ہندوستان کی سرحد پر ہیں
دخل دینے کا موقع ملے گا۔

اور اگر مسلمانوں کو محکوم اور ہندوؤں کو حاکم سمجھا جاتا ہے تو ہندوؤں کو چاہیئے

کہ اپنا دل وسیع کریں۔ تنگ نظری چھوڑ دیں۔ مسلمانوں کے ساتھ شفقت اور محبت کا سلوک کریں جو ایک اچھے حاکم کا طریقہ ہے۔ ہر انسان کی طرح ہر حاکم کے اچھے دن بھی ہوتے ہیں اور برے دن بھی۔ رعیت ناراض اور ناخوش ہو تو انہدام حکومت کا سبب بنتی ہے ؎

رعیت چو بیخ اند و سلطاں درخت
درخت اے پسر باشد از بیخ سخت

سعدی رحمتہ اللہ علیہ نے ایک حکایت لکھی ہے کہ کسی مردم آزار نے ایک نیک آدمی کو پتھر مارا۔ اس مرد نیک میں بدلہ لینے کی طاقت نہ تھی۔ اس نے ضبط کیا اور موقع کی تاک میں رہا۔ ایک دن بادشاہ اس مردم آزار سے سخت ناراض ہوا اور اسے کنویں میں اتروا دیا کہ اس میں مقید رہے۔ اب اس مرد نیک کو موقعہ ہاتھ آیا، کنویں کے پاس پہنچا اور وہی پتھر اس کے سر پر مارا۔ مردم آزار نے وجہ پوچھی اور کہا کہ اتنے دنوں تک بدلہ کیوں نہیں لیا۔ اس مظلوم نے جواب دیا کہ تیرے مرتبہ سے خائف تھا، اب تو اس حال میں ہے کہ تجھ سے بدلہ لے سکوں۔ اس لئے بدلہ لے لیا۔

شیخ سعدی کی گلستاں بوستاں پہلے اردو بولنے والے بچوں کو پڑھائی جاتی تھی۔ ابھی ہندو بھائیوں میں بہت سے ایسے ہوں گے جنہوں نے گلستاں بوستاں بچپن میں پڑھی ہوگی۔ انہیں چاہئے کہ ان حکیموں اور عقلمندوں کے قول سے اور تاریخ کے واقعات سے سبق لیں اور ہرگز بیوقوفی اور نادانی کے کام نہ کریں۔ گاندھی جی اور جواہر لال بیوقوف نہیں تھے۔ اگر مسلمانوں کو پریشان کرنے میں ہندوؤں کا فائدہ ہوتا تو وہ ہرگز ہندوؤں کو زیادتی کرنے سے منع نہ کرتے۔

ہندوؤں میں گاندھی جی کی طرح بہت لوگ ہیں جو فساد پسند ہندوؤں کے حامی نہیں ہیں۔ ان کو چاہئے کہ اٹھ کھڑے ہوں اور فساد پسندوں کو روک کر ملک کو خطروں سے بچائیں۔

یہ دلآزاری اور اسکا علاج

دہلی کے ایک ہندو اخبار نے لکھا ہے کہ مکہ میں بہت شیولنگ تھے جنہیں برباد کردیا گیا لیکن ایک شیولنگ ابتک ہے جسے مسلمان حج کے ایام میں بوسہ دیتے ہیں۔

مسلمانوں کا عام طور پر یہ خیال ہے کہ یہ الفاظ مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو مجروح کرنے اور ان کو مشتعل کرنے کی غرض سے لکھے گئے ہیں۔

اس پر بحث ہو سکتی ہے کہ صاحب مضمون کی غرض کیا ہے لیکن اس پر دو رائے نہیں ہو سکتی کہ ان الفاظ سے مسلمانوں کے دل زخمی ہوتے ہیں۔ ایک عرصہ ہوا ہند پارلیمنٹ میں بھی ایک ہندو کانگریسی ممبر نے اسی طرح کی بات کہی تھی اور مسلمانوں کی شرافت نفس کا امتحان لیا تھا۔ مسلمان تو شیولنگ کا تذکرہ بھی اپنی مجلس میں شرم وحیا کے خلاف سمجھتے ہیں چہ جائیکہ ان کی عبادت اور عبادت خانوں کے بارے ایسی باتیں کہی جائیں۔

حقیقت یہ ہے کہ آج کل مسلمان بڑے امتحان کے دور سے گزر رہے ہیں جس طرح نادر شاہ نے تیمور کی بیٹیوں کی عزت کا امتحان لینے کے لئے ان کو رقص کرنے پر مجبور کیا تھا اسی طرح اس آزاد ہندوستان میں بعض برادران وطن ایسی باتیں لکھ کر ہمارے تحمل اور بردباری کا امتحان لیتے ہیں۔ اللہ ہی جانتا ہے کہ ہم ایسی باتیں اسلئے برداشت کر رہے ہے کہ ہم بے غیرت ہیں یا اسلئے کہ ہم حلیم ہیں۔ اگر ہم بے غیرت ہیں تو ہمیں غیرتمند بننا چاہیئے۔ اگر ہم حلیم ہیں تو حلم کا تقاضہ صرف یہ نہیں ہونا چاہیئے کہ ہم ایسی باتوں کو برداشت کرلیں بلکہ ان بعض برادرانِ وطن کے ذوق لطیف اور احساس شریف کو بیدار کرنا چاہیئے اور جب وہ نیچی سطح سے اونچے ہو جائیں گے تو وہ مسلمانوں کے مذہب سے ایسی باتیں منسوب نہیں کریں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہم نے ہندو بھائیوں میں کام نہیں کیا ہے۔ انہیں بہتر عقیدہ اور احسن عمل کا تحفہ نہیں دیا ہے کیونکہ ہم خود اسفل سافلین میں جاگرے ہیں۔ بہتر ہے ہم پستی سے نکل پڑیں ترقی اور بلندی کی راہ پر گامزن ہوں۔

اسلام کو متعارف کرانے کے لئے صدیوں پہلے چند صوفیوں کی جدوجہد کے سوا کسی جدوجہد کا نشان تاریخ میں نہیں ملتا ہے۔

آیئے ہم کروڑوں مسلمان جو ہندوستان میں رہتے ہیں، اس بات کا عہد کریں کہ اسلام کا پیغام گھر گھر پہنچائیں گے اور اس وقت تک دم نہ لیں گے جب تک کہ برادرانِ وطن کے ایک ایک فرد تک ہمارا پیغام پہنچ نہ جائے۔

ہم اسلام کو قائم کریں دلیل سے اور عدم تشدد سے اور جمہوری راستوں سے۔ ملک کی بدخواہی بدامنی اور بغاوت کے ہم حامی نہیں ہیں نہ کسی کو جبراً مسلمان بنانا چاہتے ہیں۔ اسلام کو اصل رنگ وروپ میں پیش کرنا فرقہ پرستی نہیں ہے۔ مہاتما جی نے ہندو مذہب کی قدروں کی حفاظت کی۔ کیا وہ فرقہ پرست تھے؟ سابق صدر جمہوریہ رادھا کرشنن ہندو فلسفہ کے ترجمان تھے، کیا وہ فرقہ پرست تھے؟ ہمارے بوڑھے رہنما راجہ جی نے ہندو مذہب کی کہانیوں رامائن اور مہابھارت کا انگریزی میں ترجمہ کیا، کیا وہ فرقہ پرست تھے؟ یہ لوگ فرقہ پرست نہیں تھے۔ جب ان کو ہندو مذہب کی تشریح کی ضرورت پڑی تو مسلمانوں کو اس کی سب سے زیادہ ضرورت ہے کہ وہ اسلام کے صحیح خدوخال برادران وطن کے سامنے پیش کریں تاکہ وہ اسلام کے بارے میں اپنی لاعلمی کی وجہ سے یا کسی اور وجہ سے عجیب عجیب باتیں نہ کہا کریں۔ ان کو بتائیں کہ اسلام حق ہے، قابلِ استفادہ ہے اسلام نے دنیا کو پہلے بھی فائدہ پہنچایا ہے اور اب بھی اس سے فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ اسلام کے بغیر دنیا اپنے دکھ درد کو نہیں دور کر سکتی۔

اسلام پر خود عمل کیجئے اور دوسروں کو عمل کی ترغیب دیجئے۔ ان دلآزاریوں کا یہی علاج ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کتنی اذیتیں دی گئیں، آپ کی

کتنی توہین کی گئی۔ آپ کے اصحاب نے سب برداشت کیا اور وہ اسلام کا ڈنکا پیٹتے رہے یہاں تک کہ عرب کے صحراؤں میں اسلام ہی کی صدا بلند ہونے لگی۔ آج اسی حلم اور اسی عمل کی ضرورت ہے۔

ہم اپنا کام کریں

ہم پر اپنی ذات کی، اپنے ماں باپ کی، اپنے بیوی بچوں کی، خویش واقارب کی، گاؤں اور محلہ والوں کی، ملک کی، نوع انسانی کی کچھ ذمہ داریاں ہیں۔ ان ذمہ داریوں کو ادا کرنے کی صورتیں ہیں۔ ایک صورت وہ ہے جو اسلام نے ہمیں بتائی ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ اسلام کے بتائے ہوئے طریقوں پر ہی ہم اپنی ذمہ داریوں کو باحسن وجوہ انجام دے سکیں گے۔ اسلام کو چھوڑ کر ہم اپنی ذمہ داریوں کو پوری طرح ادا نہیں کر سکتے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ہمیں اسلام کا علم ہو، اس کی صحت کا یقین ہو اور اس پر عمل کرنے کا شوق وولولہ ہو۔ اگر اسلام پر ہمارا یقین کمزور ہے تو ہم اپنی ذمہ داریاں جو اسلام نے ہمارے کاندھوں پر ڈالی ہیں پوری نہیں کر سکتے۔ اسی طرح اگر ہمیں اپنی ذمہ داریوں میں سے کسی ایک ذمہ داری کے ادا کرنے کا شوق وولولہ نہیں، جوش نہیں تو کم از کم اس ایک ذمہ داری کے ادا کرنے میں ہم ضرور ناکام رہیں گے۔

وطنی ذمہ داریوں کا جو دیندار مسلمان احساس رکھتے ہیں انہیں اس بات سے تکلیف ہوتی ہے کہ اسلام اور وطن کو دو مخالف چیزیں قرار دیں۔ اس سے وطنی ذمہ داریوں سے لاپروائی پیدا ہوتی ہے اور وطن کی اصلاح اور ترقی کی خواہش پیدا نہیں ہوتی۔ وطن کو اسلام کی لائنوں پر چلانے کا جذبہ کمزور پڑ جاتا ہے اور ہمارا مذہب ایک فرقہ میں محدود ہو کر رہ جاتا ہے۔ ہمیں چاہئے کہ جہاں ہم رہیں اس کی اصلاح کی کوشش کریں اور اس کے لئے کتاب وسنت سے روشنی حاصل

کریں اس لئے جو محب وطن ہیں ان کے خیال میں تفریق وہی لوگ پیدا کرتے ہیں جو وطن اور اسلام دونوں کے دشمن ہیں۔ گرچہ وہ اسلام کی حمایت کا دم بھرتے ہیں جو اسلام کی تعلیمات پر یقین رکھتے ہیں اور سچے دل سے اسلام کے حامی ہیں وہ اس طرح نہیں سوچ سکتے۔

ہم اس جدید رجحان سے واقف ہیں کہ وطن اور مذہب کو الگ کیا جائے۔ اور وطن کو مذہب پر ترجیح دی جائے۔ ہم اس رجحان کے بھی خلاف ہیں نہ ہم یہ پسند کرتے ہیں کہ ہم وطن کو علیحدہ کر کے مذہب کو مانیں کیونکہ مذہب ایک دعوت ہے جو وطن کے باشندوں کو دینا ہے ہم یہ پسند نہیں کرتے کہ مذہب کو علیٰحدہ کر کے وطن کی ذمہ داری اٹھائیں۔ ہمارے نزدیک وطن کا فائدہ مذہب پر عمل کرنے میں ہے۔ مذہب کے لئے ہمارے سب سے پہلے مخاطب اہل وطن ہوں گے۔ وطن ایک مکان ہے اور مذہب اس مکان کے باشندوں کو خیر کی دعوت دیتا ہے۔ وطن کو علیحدہ کر کے ہم مذہب کا مخاطب کس کو بنائیں گے؟ بیشک اسلام ساری دنیا کو دعوت دیتا ہے اور پوری انسانیت کے لئے مفید ہے لیکن وطن کو چھوڑ کر دنیا کے باقی حصوں کو مخاطب کرنا کوئی معقول بات نہیں۔

دین میں جبر نہیں ہے۔ ہم اپنے خیال کو ماننے پر کسی کو مجبور نہیں کر سکتے۔ جبتک ہمارے ملک کے باشندے ہمارے ہم خیال نہیں ہوتے اس وقت تک ہم اپنی کوشش جاری رکھیں گے اور لوگوں کو اسلام کی افادیت سمجھائیں گے۔ جو اسلام کو سمجھتے اور اسلام کے حامی ہیں ان کا فرض ہے کہ وہ دل وجان سے اس راہ پر لگ جائیں اور لوگوں کو بتائیں کہ اسلام کو ماننے میں ملک اور انسانیت کا کتنا بڑا فائدہ ہے۔

اس پر آمادہ کرنے کے لئے کہ ہماری بات سنجیدگی سے سنی جائے اور اس پر غور کیا جائے، ضرورت ہے کہ ہم بلند کردار اور اچھے اخلاق کے حامل ہوں۔ ہم پولیس اور فوج سے نہیں، زبردستی اور تشدد سے نہیں بلکہ محبت اور دلیل کی قوت سے، وعظ ونصیحت سے، تلقین وتعلیم سے ایسی فضا تیار کر سکتے ہیں کہ کچھ فیصدی

تو برائیوں سے بچ جائیں اور نیک باتوں کی طرف دوڑیں۔ یاد رکھیے، اچھے ہمسائے ہمارے لئے خیر اور برے ہمسائے ہمارے لئے شر ثابت ہوں گے۔

کام صبر آزما ہے۔ اکتانے اور گھبرانے سے بڑے کام انجام نہیں پاتے۔ ایک زمانہ کی جدوجہد کے بعد ہی ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکتے ہیں اور پھر ہماری جدوجہد ایک زمانہ تک نفع بخش بھی رہے گی۔ جو اپنی کوششوں کا انجام جلد چاہتے ہیں وہ بھول میں ہیں۔ وہ ہتھیلی پر سرسوں جمانا چاہتے ہیں۔ ہمیں اپنی پوری قوت اس مقصد کے لئے صرف کرنا چاہئیے اور اللہ تعالیٰ سے کامیابی کی دعا کرنی چاہئیے اور اس کے فضل و رحمت پر یقین کرنا چاہئیے۔ حضور صلعم نے جلد بازی کی مذمت فرمائی ہے۔ ہم بستے بستے بستی بساتے ہیں، چڑھتے چڑھتے اوپر جاتے ہیں اور کرتے کرتے مقصد حاصل کرتے ہیں۔ ایک دفعہ میں پورا کام نہیں ہوتا۔ شاہ بلوط کا درخت ایک سو سال میں تناور درخت بنتا ہے۔ ملی تعمیر کا کام ہو یا دین کی دعوت کا کام، دونوں طویل اور صبر آزما کام ہے۔ یہ زمین پر شاہ بلوط کا درخت اگانا ہے۔

دنیا کو محبت اور مذہب کی ضرورت

مدراس کی عورتوں کے ایک مجمع کو صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر رادھا کرشنن نے خطاب کیا۔

انہوں نے کہا کہ دنیا کی موجودہ الجھنوں کا علاج صرف محبت ہے۔ بم کے دھماکے نہیں ہیں۔ فوجوں کی کثرت نہیں ہے۔ اسلحوں کا مقابلہ نہیں ہے۔ کانفرنسیں نہیں ہیں، دھمکیاں نہیں ہیں بلکہ سطحیات سے پاک بے غرض محبت ہے۔ انہوں نے کہا کہ پوری دنیا کو اپنا کنبہ سمجھو۔ کرۂ ارض کو اپنا وطن سمجھو اور اس معنی میں حب الوطنی پیدا کرو۔ جب ہم کہیں وطن کے لئے ایثار کرو، وطن کی خیر خواہی میں مر مٹو تو اس کا مطلب ہرگز یہ نہ لیا جائے کہ زمین کے کسی مخصوص حصہ کی خیر خواہی کر کے ہم اپنا فرض پورا کر

لیں گے اور اس خطہ سے باہر لوگوں کی خیر خواہی ان کے لئے ایثار ان کی تکلیفوں کو دور کرنے کے لئے مرمٹنا وطن کے خلاف ہوگا۔ دنیا کے کسی حصہ میں کوئی انسان بستا ہے تو اس کی خیر خواہی ہمارا فرض ہے۔ گالیوں کا جواب دعاؤں سے نفرت کا جواب محبت سے دو۔ ہر انسان دوسرے انسان کی تکریم و تعظیم کرے گا۔ اگر ہمارے دل محبت سے بھر جائیں، اگر ہم اکرام آدم کا سبق پڑھ لیں تو ہم خود بخود اشتراکیت اور مساوات کی طرف قدم بڑھائیں گے اور دنیا کی کوئی طاقت ہمارے اندر اونچ نیچ کو باقی رکھنے میں کامیاب نہ ہوگی۔ جب ہم اپنے کو کسی سے چھوٹا نہیں سمجھیں گے، جب ہمارے اندر دوسروں کے لئے ایثار کا جذبہ پیدا ہوگا، جو محبت کا لازمی نتیجہ ہے تو ہم زائد چیزیں اپنی رضا اور خوشی سے اپنے بھائی کے حوالہ کر دیں گے اس کا انتظار نہیں کریں گے کہ اس سے مطالبہ کیا جائے۔ موصوف نے کہا کہ اس انسانیت بھائی چارگی اور اس محبت کو دوام بخشنے کے لئے مذہب کی ضرورت ہے۔ انہوں نے انگلستان کے مشہور فلسفی رسل کا حوالہ دیا جن کا قول ہے: "مذہب کو چھوڑ دینے کے بعد ہم پورے انسان نہیں رہتے۔ ہم اپنی انسانیت میں کچھ کمی محسوس کریں گے۔

ڈاکٹر صاحب کی یہ تقریر ان کانوں سے ٹکرانی چاہیئے جو مذہب کے مخالف ہیں اور جو حب الوطنی کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ ہندوستان کے سوا تمام دوسرے ملکوں کے بسنے والوں کو غیر سمجھا جائے حتیٰ کہ ان کی خدمات کی قدر بھی نہ کی جائے جو انہوں نے انسانیت کے لئے اور خود ہندوستان کے لئے کی ہیں بلکہ ان کی خواہش ہے کہ ان کی قیمتی یادگاریں جو ہندوستان میں ہیں ان کو بھی مٹا دیا جائے۔ دنیا جانتی ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو کس کس طرح مطعون کیا جاتا ہے کہ وہ تنگ نظرانہ حب الوطنی کے قائل نہیں ہیں، وہ عرب، ایران، پاکستان اور افغانستان سے محبت کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں دجلہ، فرات کے تذکرے ہیں، ان کی کتابوں میں رستم و سہراب کی کہانیاں ہیں۔ انہوں نے عقائد اور اعمال میں ہدایت عرب کے نبی امی کی قبول کی ہے۔ کاش یہ مطعون کرنے والے اپنے ملک کے اس مایہ ناز

فلسفی کی نصیحت کا بغور مطالعہ کریں اگر وہ ایسا کر سکیں تو آج ہندوستان ترقی کے راستہ پر زیادہ تیزی سے گامزن ہو جائے۔

اسی طرح کی بات ونوبا بھاوے نے آسام میں کہی جہاں وطن سے مراد ہندوستان نہیں بلکہ آسام لیتے ہیں۔ ونوبا جی نے کہا کہ اب زمانہ جے ہند کا بھی نہیں رہا۔ اب تو جے جگت کا زمانہ ہے۔ ہمیں ساری دنیا سے تعاون کر کے اور سبھوں کی مدد لے کر بڑھنا ہے۔ صرف ہندوستان پر تکیہ کر کے ہم ترقی نہیں کر سکتے۔ اس لئے ہمیں دنیا والوں کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھالنا چاہیئے۔

مسلمانوں کو بھی چاہیئے کہ وہ صدر جمہوریہ اور ونوبا بھاوے کی اس نصیحت پر عمل کریں۔ اکرام آدام کی تعلیم نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم ہے۔ یہ آپ کا قول ہے کہ اللہ کی مخلوق اللہ کی عیال ہے۔ آپ نے کہا کہ عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت نہیں، سب آدم کی اولاد ہیں۔ اور آدم مٹی سے بنے تھے۔ اگر اللہ سے محبت ہے تو اللہ کی مخلوق سے محبت اور اس کی خیر خواہی از بس ضروری ہے۔ صدیوں سے صوفیائے کرام محبت پر زور دیتے آئے ہیں۔ شعراء نے محبت کے ترانے گائے ہیں، واعظوں نے محبت کا پیغام دیا ہے۔ اگر ہم ان بزرگوں کی تعلیمات کو بھول گئے ہیں، اگر احسن تقویم کے بلند مقام پر فائز ہونے کے باوجود ہم اسفل سافلین میں جا گرے ہیں، اگر ہمارے دل نفرت و عداوت سے بھر گئے ہیں اور ہم نے اپنا طریقہ تبنالیا ہے کہ غیر مسلم تو غیر مسلم، خود مسلمانوں سے ہم نفرت کریں، اپنے خاندان کے سوا دوسرے خاندانوں سے نفرت کریں، اپنے مدرسوں کے علاوہ دوسرے مدرسوں سے نفرت کریں، اپنے ادارہ اور اپنی مجلس کے علاوہ دوسرے اداروں اور دوسری مجالس سے نفرت کریں اور ہم بھول گئے ہیں کہ خود ہمارے یہاں محبت کی کیا تعلیم ہے۔ تو کم از کم اس غیر مسلم فلسفی کی باتوں کو ہی ضالۃ المومن (مومن کی کھوئی ہوئی چیز) سمجھ کر اپنائیں، تعصب اور تنگ نظری کو دخل نہ دیں۔

انقلاب پاکستان سے سبق

ہم نے اپنے بچاؤ کے لئے زبردستی فوجی نظام قائم کیا ہے۔ جو ٹریننگ فوجیوں کی ہے وہ عام جنتا کی نہیں ہے، جو اسلحے فوجیوں کے پاس ہیں وہ ہمارے پاس نہیں ہیں۔ اگر ملک میں فوجی بغاوت ہو جائے اور جنتا اس بغاوت کو پسند نہ کرے تو بھی فوجی حکومت کو ماننا ہی پڑے گا۔ مقابلہ کی طاقت جو نہیں ہے۔ اس لئے فوج کی طاقت اور عوام کی طاقت کو متوازن رکھنا بہت ضروری ہے۔

پاکستان میں بھی یہی صورت تھی۔ حکومت پاکستان نے امریکہ سے اسلحے اور ماہرین کی مدد لی اور فوجیوں کی خوب خوب تربیت کی گئی۔ جب عام جنتا کی طاقت میں اور فوج کی طاقت میں توازن نہیں رہا تو فوج غالب آگئی اور جنرل ایوب کے دوست اسکندر مرزا کو بھی ہٹنا پڑا۔ شیر اور بکری کی دوستی کب تک نبھ سکتی تھی۔

قدرت کی ستم ظریفی دیکھئے امریکا نے ہتھیار دیئے تھے روس سے لڑنے کے لئے۔ نواب زادہ لیاقت علی نے سوچا تھا کہ وہ یہ ہتھیار ہندوستان کے خلاف استعمال کریں گے لیکن وہ استعمال ہوئے پاکستان کی جنتا کو فوج کا محکوم بنانے کے لئے۔ ہندوستان کے خلاف بھی استعمال ہوئے لیکن اس سے کوئی فائدہ پاکستان کو نہیں پہنچا کیونکہ دونوں ملکوں کی طاقت کے تناسب میں بہت فرق ہے۔ جب جناح صاحب پاکستان کے عوض مضبوط ہندوستان ہندوؤں کے حوالہ کرنے پر مصر تھے تو انہوں نے یہ تناسب نہیں سوچا تھا۔ یہ سب بانیان پاکستان بے اثر بن کر رہ گئے۔

اس واقعہ سے ہندوستان کی جمہوریت کو جو سبق لینا ہے وہ یہی کہ طاقت میں سول اور فوجی توازن برابر رہے۔ فوجی اسلحوں کے استعمال کی تربیت اور ٹکنگ کی تعلیم فوجی اور غیر فوجی سبھی ہندوستانیوں کو دی جائے تاکہ جمہوریت کو خطرہ

اندر سے ہو یا باہر سے، اس کا مقابلہ کیا جا سکے گرچہ اس طرح کا شدید خطرہ ہندستان کو نہیں ہے جس طرح پاکستان کو تھا کیونکہ پاکستان کے لیڈر اور عوام دونوں کسی کو کبھی جمہوریت پر یقین نہیں تھا۔ لیڈر یہ سمجھتے تھے کہ وہ انگریزوں کے بغیر کچھ کر ہی نہیں سکتے۔ عوام کی کیا طاقت ہوتی ہے، اس کا انہوں نے تجربہ نہیں کیا۔ پڑھے لکھے لوگ ڈاکٹر اقبال کے فلسفہ میں الجھ گئے۔ ان کا یہ قول "جمہوریت میں سروں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے" پاکستانیوں کے لئے افیون ثابت ہوا۔

ہندوستان کے لیڈر خود اعتمادی کی دولت سے مالا مال ہیں۔ ان کا یہ خیال ہمیشہ رہا کہ انگریز کوئی اچھی حکومت نہیں چلا سکتے اور یہ کہ انہوں نے ہندوستان کو برباد کیا۔ عوام کی طاقت کا انہوں نے تجربہ بھی کر لیا۔ اگر کوئی فوجی بغاوت ہوئی تو ہندوستان کے عوام اپنے لیڈروں کی رہنمائی میں اس کا مقابلہ کر سکتے ہیں اور پاکستانیوں کی طرح خاموش تماشائی نہیں رہ سکتے۔

بہر حال احتیاط یہی ہے کہ ہم جنتا اور فوج کی قوتوں کے درمیان توازن بگڑنے نہ دیں۔ ونوبا جی، آچاریہ کرپلانی اور راجہ جی اس کے خلاف ہیں کہ پاکستان سے یا کسی سے بھی ڈر کر ہم کوئی بڑا فوجی نظام قائم کریں اور مال کا بڑا حصہ اس پر صرف کریں۔ ہمارے خیال میں ان حضرات کی رائے صحیح ہے۔ اس دور میں خطرے باہر کے نہیں ہوتے بلکہ اندر کے ہوتے ہیں۔ اندرون ملک میں مختلف جتھوں اور گروہوں کو غیر متوازن بنایا گیا تو قوی کمزور کو دبا دے گا۔ ہمارا نعرہ ہے یا سبھوں کو فوجی بناؤ یا فوج کو اتنی قلیل مقدار میں رکھو کہ ہم علیحدہ علیحدہ لوگوں پر تو فوج بھاری ہو لیکن ہم سب مل جائیں تو فوج پر بھاری ہو جائیں۔ جمہوریت کے پنپنے کی صورت یہی ہے ورنہ جو مصر میں ہوا فرانس میں ہوا پاکستان میں ہوا، برما، شام اور سوڈان میں ہوا وہی ہمارے یہاں ہوگا۔

یہ ۲۶ برس پرانا مضمون ہے لیکن آج بھی پاکستان ہم کو یہی سبق دے رہا ہے۔ پاکستان کی فوج پاکستان کے عوام کو سر اٹھانے نہیں دے رہی ہے۔ بھٹو اس کے

باوجود کہ عوام ان کے ساتھ تھے، فوج کے مضبوط پنجوں کا مقابلہ نہ کر سکے اور فوج میں جو قادیانی تھے ان کی برہمی نے ان کا کام تمام کر دیا اور ضیاء الحق اس برہمی سے خائف یہ ہمت نہیں کر سکے کہ بھٹو کی پھانسی کی سزا کو تبدیل کر دیں حالانکہ دنیا کی حکومتیں ایک دو کو چھوڑ کر سب رحم کے لئے اپیل کر رہی تھیں۔

آج ہندوستان فوجی لحاظ سے کئی گنا زیادہ قوی ہے۔ اس لئے ضرورت ہو گئی ہے کہ ملک اور زیادہ چوکنا اور ہوشیار رہے۔

یہ تو منفی صورت ہے۔ مثبت صورت یہ ہے کہ جمہوریت کے فوائد ہر شہری کے ذہن نشین ہوں۔ ریڈیو، پریس اور تعلیم گاہوں سے جمہوریت کی حمایت میں آواز اٹھتی رہنی چاہئے۔ فوائد ذہن نشین محض پروپیگنڈوں کے ذریعہ نہ ہوں بلکہ عوام عملاً محسوس بھی کریں۔ حکام میں امانت و دیانت کے جذبات پیدا کئے جائیں اس کے لئے ہم مذہبی ماحول اور مذہبی تعلیم کے محتاج ہیں۔

جنتا کو چاہئے کہ آر ایس ایس جیسی فسطائی طاقت کو قوت سے دبا دے جو جھوٹی افواہیں پھیلا کر اور مختلف فرقوں میں نفرت کو ہوا دے کر ملک میں خوں ریزیاں کراتی اور وطن کے قیمتی اثاثوں کو برباد کراتی ہے۔

ہندوستانی پریس

مسٹر جے پی چترویدی صدر انڈین فیڈریشن آف ورکنگ جرنلسٹ نے بجواڑہ (آندھرا پردیش) میں کہا کہ:

ہندوستانی اخبارات کی آزادی کو آج جو خطرہ ہے وہ خطرہ تاریخ کے کسی عہد میں پیش نہیں آیا۔"

ہم آپ یہ سمجھیں گے کہ یہ خطرہ حکومت کی طرف سے ہے حالانکہ جن کو برطانوی عہد کے اخبارات کا تجربہ ہے وہ یہ جانتے ہیں کہ اس وقت کے مقابلہ میں

آج پریس کو بہت زیادہ آزادی ہے۔ پھر یہ خطرہ کس سے ہے؟ چترویدی صاحب فرماتے ہیں:

"یہ خطرہ ان لوگوں سے ہے جو پریس کی آزادی کے علمبردار ہیں۔"

اور کس طرح یہ خطرہ پیش آرہا ہے، اس کا انکشاف چترویدی نے یوں فرمایا:

"ہندوستان کا پریس چند آدمیوں کی ملکیت بن رہا ہے۔ دس فیصد اخبارات ہندوستان کی پچاس فی صد اشاعت پر کنٹرول کر رہے ہیں۔ انہیں اس فیصلہ کا اختیار ہے کہ ملک کی اکثریت کیا پڑھے اور کیا نہ پڑھے۔ یہی حضرات ہندوستان کی بڑی بڑی خبر رساں ایجنسیوں پر قبضہ رکھے ہوئے ہیں۔

مندرجہ بالا بیان سے زیادہ سچی بات ہندوستان کے آسمان کے نیچے کبھی نہیں کہی گئی۔ اس میں اتنا اضافہ اور کیجئے کہ یہ دس فیصد اخبارات متعصب تنگ نظر اور فرقہ واریت سے مسموم اور سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں ہیں جو غریبوں کو تباہ و برباد کرنے سے نہیں گھبراتے۔ حکومت چاہتی کیا ہے، یہ تو حکومت بتائے گی، لیکن آزادی کے بعد پریس کو جو آزادی حکومت کی طرف سے ملی ہے وہ بڑی حد تک قابلِ تعریف ہے۔ کم از کم ہمارا اپنا تجربہ یہی ہے۔ ہم نے حکومت کی غلطیوں کی نشاندہی کرنے میں کبھی کوتاہی سے کام نہیں لیا۔ ہماری تنقیدوں سے ہمارے دوست گھبرائے اور حریفوں نے جا جا کے تھانہ میں رپٹ لکھوائی۔ مگر ہمارے دوستوں کا خوف غلط ثابت ہوا۔ اور حریفوں کی دوڑ دھوپ ناکام رہی۔ یہ صحیح ہے کہ ایک دو اخبارات حکومت کا نشانہ بنے لیکن یہ مقامی غیر ذمہ دار افسروں کا ذاتی فعل تھا۔ بعض جن سنگھی اخبارات حکومت اور مسلمانوں کے خلاف زہر اگلتے رہے لیکن حکومت نے ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی۔

مسلمان اخبارات باستثنائے چند اپنی آزاد پالیسی خوف کی وجہ سے نہیں بناتے ہیں اور وہی خبریں دیتے ہیں اور اکثر وہی لکھتے ہیں جو خبریں انہیں بڑے بڑے

اخبارات اور خبر رسا ایجنسیوں کے ذریعہ ملتی ہیں لیکن یہ خوف مسلم لیگ کے ان پروپیگنڈوں کا نتیجہ ہے جو آزادی سے پہلے انہوں نے کیا اور فرقہ پرست ہندوؤں کے ان اقدامات کا نتیجہ ہے جو آزادی کے بعد ان کی طرف سے ہوئے۔ حکومت کا اس میں کہاں قصور ہے اس کا اندازہ ناظرین اس کتاب کے مضامین سے کر سکیں گے جو آزادی کے بعد مختلف اخبارات میں شائع ہوتے رہے ہے۔

ہم نے شیخ عبداللہ کی ان تقریروں کو بھی اخبار نقیب میں شائع کیا جو انہوں نے کشمیر میں مختلف اوقات میں کی تھیں اور جن کو ہندوستان کے پریس نے نشر نہیں کیا تھا۔ بڑے بڑے اخبارات نے تعصب کی وجہ سے اور مسلمان اخبارات نے خوف کی وجہ سے۔ لوگ ہماری جرأت کی داد دیتے تھے اور ہم آزاد ہندوستان کی۔ شیخ صاحب کی تقریر اس لئے نشر نہیں ہوئی کہ ان سے ان غلط الزامات کی تردید ہو جاتی تھی کہ شیخ صاحب پاکستانی ہیں۔ ہم اپنا فرض سمجھتے تھے کہ ان کی صحیح تصویر عوام کے سامنے آجائے تاکہ ان سے اتفاق اور اختلاف صحیح بنیادوں پر کیا جا سکے۔

اردو اخبارات جو عموماً سرمایہ داروں کے قبضہ میں نہیں ہیں، انہیں چاہئے کہ ان بڑے بڑے اخبارات اور خبر رساں ایجنسیوں کی دی ہوئی اور بعض گھڑی ہوئی خبروں سے متاثر نہ ہوں اور عوام اور حکومت تک صحیح اطلاع پہنچائیں۔ اگر حکومت میں کچھ لوگ ہیں جو یہ نہیں چاہتے کہ صحیح باتیں اخبارات میں شائع ہوں تو ان کی پرواہ نہیں کی جائے تاکہ رائے عامہ مضبوط سے مضبوط تر ہو۔ عوام کی صحیح رہنمائی اشتہارات سے زیادہ قیمتی ہے۔

خبروں کے انتخاب میں اور حکومت پر تنقیدوں میں ملک اور انسانیت کی بھلائی کو ملحوظ رکھنا چاہئے۔ اگر حکومت ایسی تنقیدوں کو برداشت نہ کرے تو ہمیں چاہئے کہ ایسی تنقیدوں کو برداشت کرنے پر حکومت کو مجبور کریں۔

اصلاح نصاب

خروشچوف نے روس کے طلبہ کو مشورہ دیا کہ ایسے فنون پر عبور حاصل کرنے میں وقت ضائع نہ کریں جن کی ضرورت زندگی میں فوراً نہیں پڑتی۔ انہوں نے کہا کہ نوجوانوں کو جلد از جلد ملک کی پیداوار بڑھانے میں حصہ لینا چاہئے قرینہ ہے کہ روس میں سترہ برس کی عمر کے نوجوان ضروری تعلیم حاصل کر کے کارخانوں میں پہنچ جائیں گے۔

ہمارے یہاں بھی تعلیم کا بڑا حصہ غیر ضروری امور سے متعلق رہا ہے۔ ہمارے نوجوان فلسفیانہ اور شاعرانہ موشگافیوں میں کافی وقت صرف کرتے ہیں اور ان علوم کی طرف متوجہ رہتے ہیں جن کی ضرورت پڑھنے کے بعد ان کو نہیں ہوتی۔

ہمارے ایک دوست نے جو تاریخ میں فرسٹ کلاس فرسٹ ام اے تھے پڑھنے کے بعد بتایا کہ بہار سکریٹریٹ میں مجھے کلرکی ملی۔ ساری زندگی کلرک رہا۔ تاریخ کی تمام باتیں بھول چکا ہوں لیکن پھر بھی لوگ تاریخ کے معاملہ میں مجھ سے رجوع کرتے ہیں۔ یہی حال کئی دوسرے مضامین کا ہے۔ علم ریاضی بھی بچوں کو اتنا پڑھا دیا جاتا ہے کہ روزمرہ کی زندگی میں انہیں اس کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اور وہ کچھ عرصہ کے بعد بھول جاتے ہیں۔ اور صرف کسر تک کا حساب ان کے ذہن میں رہ جاتا ہے۔

نصاب مذہبی مدارس کے ہوں یا غیر مذہبی مدارس کے، سب ہی قابل اصلاح ہیں۔ مذہبی مدارس میں فقہ کے مسائل اکثر ایسے ہیں کہ ان کی ضرورت فوراً محسوس ہوتی ہے لیکن منطق و فلسفہ کی موشگافیاں تو شاید کسی مدرسہ کی ملازمت اور درس و تدریس میں ہی کام آتی ہیں۔ اس لئے ایسے علوم کو سب کے لئے ضروری نہیں بنانا چاہیئے بلکہ ان کی جگہ صنعت و حرفت وغیرہ کا حصہ بڑھا دینا چاہیئے۔ یہ ہم نے مثالاً لکھا ہے۔ تفصیل میں نہیں جا رہے ہیں۔

غیر مذہبی علوم میں تو بہت زیادہ غیر ضروری علوم رکھ دیئے جاتے ہیں۔ انگریزوں کے زمانہ میں انگلستان کی تاریخ اسکولوں میں لازماً پڑھائی جاتی تھی۔ ظاہر ہے اس کی ضرورت نہ تھی۔ کسی طالب علم کو شوق ہوتا تو اختیاری مضمون کے طور پر لے لیتا۔ سعودی عرب میں ہر طالب علم کے لئے انگریزی پڑھنا ضروری ہے حالانکہ نہ انگریزی یہاں کی سرکاری زبان ہے نہ مادری زبان ہے۔ جس کو شوق ہوتا یا جس سے انگریزی کا کام لیا جاتا اس کے لئے اختیاری مضمون کے طور انگریزی ہوتی۔

اصلاح نصاب کا خیال ایک عرصہ سے ملک میں پھیل رہا ہے۔ سرکاری اور غیر سرکاری طور پر کوششیں بھی ہوئی ہیں اور تبدیلیاں بھی کی گئی ہیں لیکن قدامت سے رشتہ باقی رکھنے کے جذبے نے ہمیں اس بات پر مجبور کر دیا ہے کہ نصاب میں کئی قدیم علوم کو برقرار رکھا جائے۔ جن کی ہم کو ضرورت نہیں ہے۔

تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ فرد کو اس لائق بنا دیا جائے کہ وہ سماج کا بہترین رکن بن سکے۔ یعنی وہ سماج کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچائے۔ اور سماج سے اس طرح زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائے کہ اس کی ذات سے کسی کو تکلیف یا نقصان نہ پہنچے فرد کو جن لوگوں میں زندگی گذارنی ہے انہیں کو وہ فائدہ پہنچائے گا اس لئے تعلیم کے مختلف ادوار کے لئے نصاب بھی مختلف ہونا چاہیئے۔ جن کو اپنے گاؤں اپنے شہر میں زندگی گذارنی ہے ان کا نصاب اسی ضرورت کے مطابق ہونا چاہیئے اور جن کو ہندوستان کے باہر سے علم اخذ کرنا ہے اور دوسرے ملکوں سے علم کا تبادلہ کرنا ہے ان کا نصاب اس کے مطابق ہونا چاہیئے۔ ہندوستان کے عام لوگ عموماً ہندوستان میں ہی رہیں گے اور ان کا رابطہ امریکہ والوں سے نہ ہوگا۔ اسلئے ان کی تعلیم اس طرح ہو کہ ہندوستان کے لوگ اس سے فائدہ اٹھائیں اور وہ ہندوستان والوں سے فائدہ اٹھائے۔

ہمارے تعلیمی کارخانہ سے جو فرد تیار ہو کر نکلتے ہیں وہ ہماری ضرورتوں کو پورا نہیں کرتے۔ کسانوں کے بچے پڑھتے ہیں لیکن وہ بی اے پاس کر کے کاشتکاری کے

لائق نہیں رہتے۔ اگر ملک میں سو فیصد ایسے تعلیم یافتہ ہو جائیں تو کیا اس کا نتیجہ یہ نہ ہوگا کہ ملک میں کاشتکاری بند ہو جائے۔ اس لئے اگر ہمیں ملک میں تعلیم کی اشاعت کرنی ہے تو ہمیں تعلیم ایسی دینی چاہیئے جس سے کاشتکار عمدہ کاشتکار بنے، بڑھئی عمدہ بڑھئی بنے، لوہار عمدہ لوہار ہو۔ ملک کو حرف آشنا بنانے کے ساتھ ساتھ ان فنون کی تعلیم دینی چاہیئے جو ملک میں رائج ہیں یا آسانی سے رائج ہو سکتے ہیں اور جن سے ملک کو فوراً فائدہ پہنچ سکتا ہے اور ساتھ ہی محنت کا عادی بنانا چاہیئے۔ فرد کو ان حقوقِ شہری سے آشنا ہونا چاہیئے جن کو جاننے کے بعد اس جمہوری ملک کے اربابِ انتظام کو ووٹ دینے میں وہ صحیح فیصلہ کر سکے۔ عقائد و اخلاق کی اصلاح کے لئے نصاب میں گنجائش ہونی چاہیئے۔ بغیر سچائی اور محبت الٰہی کوئی شہری اچھا شہری نہیں بن سکتا۔ ایک ایسے ماحول کی تخلیق ضروری ہے جس میں حکومت کے خوف سے نہیں بلکہ خدا کے خوف سے انسان برائیوں سے بچنے کی کوشش کرے کہ اس صورت میں برائیوں کی روک تھام زیادہ آسان ہوگی۔

آزادی کے بعد نصاب میں جو اصلاح ہوئی ہے وہ بعض ضرورتوں کو پورا تو کرتی ہے لیکن ابھی یہ ناکافی ہے۔ عربی مدارس میں بھی اصلاح کی کوششیں کمزور ہیں۔ درسگاہوں میں اس بات کی کوشش کہ طالب علم اردو ادب میں مولانا ابوالکلام آزاد اور عبدالماجد دریابادی ہو جائے، عربی میں طٰہٰ حسین مصری ہو جائے یا انگریزی میں شیکسپیئر اور برنارڈ شا ہو جائے، مضحکہ خیز ہے۔ ہمیں زبان کو فنون کے سیکھنے کا ذریعہ بنانا چاہیئے اور اسی قدر تعلیم زبان کی مدارس میں ہونی چاہیئے۔ کالجوں اور مدرسوں سے فارغ طلبہ کسانوں کی بولی سمجھنے سے بھی عاجز ہوتے ہیں۔ وہ ایسی بولی بولتے ہیں اور سمجھ سکتے ہیں جو تعلیم یافتہ طبقہ میں ہی بولی اور سمجھی جا سکتی ہے۔ حالانکہ ابھی وہ منزل دور ہے جب ملک کا ہر فرد تعلیمیافتہ ہو جائے گا۔ اس منزل میں ملک کی اکثریت کی بولی سے اس قدر غیریت حد درجہ مضر ہے۔

اگر ہم نے اپنے جوانوں کو ایسے فنون کو سیکھنے میں لگائے رکھا جن کی ضرورت ان

کو فوراً نہیں ہوگی تو حقیقت میں ہم اپنی قوم کو ضعیف اور کمزور بنائیں گے۔ ترقی کے اس دور میں ہمیں وقت کی قدر کرنی چاہیئے اور لایعنی اور بے ضرورت تعلیم میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیئے۔

گناہ کا زور

شراب وغیرہ نشہ آور چیزوں کا زور مسلمانوں میں بھی بڑھ رہا ہے۔ ہم اس گناہ پر لوگوں کو ڈھیٹ اور دلیر پاتے ہیں۔ گانے بجانے کا شوق بھی مسلمانوں میں کم نہیں ہے بلکہ روز افزوں ہے اور جارحانہ نوعیت اختیار کرتا جا رہا ہے۔

جارحانہ نوعیت سے ہماری مراد ہے کہ لوگ اسی پر اکتفا نہیں کرتے کہ گانے بجانے سے صرف اپنا شوق پورا کر لیں، بلکہ کسی تقریب میں لاؤڈ اسپیکر لگا کر گراموفون بجاتے ہیں اور رات رات بھر بجاتے رہتے ہیں۔ اس کی فکر نہیں ہوتی کہ ان کے پڑوس میں اور ان کے محلہ میں کسی پر کیا گذر رہی ہے۔ کسی کا قلب کمزور ہے کوئی بلڈ پریشر کا مریض ہے، کسی کو نیند کی حاجت ہے، کوئی مصلّٰی پر بیٹھ کر مشغول عبادت ہے، انہیں تو بس اپنے شوق کی تکمیل سے غرض ہے۔

سینما کے شوق نے ان قدروں کو بدل دیا ہے جنہیں ہم سینوں سے لگائے ہیں۔ اب بے حیائی کی باتیں ناپسندیدہ نہیں رہیں۔ عریانیت کے مشاہدہ و مطالعہ کے لئے ہمارے بچوں اور ہماری عورتوں کو عام اجازت ہے۔ انہی طرز کے ناول افسانے پڑھے جاتے اور سنائے جاتے ہیں۔ سود، رشوت، بدمعاملگی، کذب، افترا یہ عیوب قابل مذمت نہیں رہے۔ خدا کو راضی کرنے کا تصور پیدا ہوتا بھی ہے تو ان گندگیوں پر ہماری نظر نہیں جاتی۔ کاش ہم سمجھتے کہ خدا کو راضی کرنے کے لئے اس کی نافرمانیوں سے توبہ اور بے حیائی اور مردم آزاری کے کاموں سے اجتناب ضروری ہے۔ کاش ہم سمجھتے کہ حلال و حرام مقرر ہیں۔ پس ہمیں حلال پر راغب اور حرام

سے بچنا چاہئے۔

پھر ایک ذلیل قوم جسے ذلت کی گہرائیوں سے عزت کی رفعتوں پر پہنچنا ہے یہ حق کہاں رکھتی ہے کہ وہ کھیل تماشوں اور ناچ گانوں میں اپنا وقت ضائع کرے ایک شخص جو کنویں میں گر پڑا ہو، اگر اس کو اچھے سے اچھا ہی سہی، گانا سنایا جائے تو یہ حماقت کی بات ہو گی۔ اس کو اس وقت آپ کے گانوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہو گی اس کو تو ایک ہی بات کی فکر ہو گی کہ کسی طرح کنویں سے نکل جائے۔

ذلیل و خوار قوم کے افراد جب ناچ و رنگ، آرٹ اور کلچر کی باتیں کریں تو یہ سمجھئے کہ ان میں غیرت بلکہ زندگی کے آثار باقی نہیں ہیں۔ ان کے لئے تو عیش و آرام حرام ہے۔ سخت کوشی اور جفاکشی، محنت و خدمت کی زندگی کا ان کو عادی بن جانا چاہئے۔

۱۵ راگست ۱۹۴۷ء

کئی سال بعد بھی ۱۵ راگست کو ہندوستان اور پاکستان میں بڑے دھوم سے یوم آزادی منایا گیا۔ کسی نے واقعی خوشی منائی کسی نے رسماً۔ کسی کی کیا مجال کہ کہے کہ مجھے خوشی نہیں ہوئی۔ خصوصاً مسلمان۔ فوراً غدار اور پاکستان کے ایجنٹ کا الزام چسپاں ہو جائے۔ یہ بدنصیب کہاں ایسی جرأت کر سکتا ہے۔

ہندوستان کا جو نقشہ آج ہے، پچاس ساٹھ برس پہلے یہ نقشہ نہ تھا۔ (یہ مضمون ۵ صفر ۸۰ھ کا ہے)۔ کسان اور مزدور تباہ حال اور برباد تھے۔ محنت کی کوئی قدر و قیمت نہ تھی۔ اس لئے کسان اور مزدور جو کچھ پیدا کرتے تھے ان کی بھی کوئی قیمت نہ تھی۔ مزدور بے دام کا غلام تھا۔ خدمت بھی کرتا تھا اور گالیاں بھی سنتا تھا۔ کسان اپنی زمین چھوڑ کر بھاگ جاتا تھا۔ جب مہاجن کو سود ادا کرنا اور زمین دار کو اس کا حصہ ادا کرنا اس کی قوت سے باہر ہوتا تھا اور زمین دار کے عملے اس کی گرفت کرتے تھے۔ سرکاری ملازمت کے دروازے بھی صرف شرفاء کے لئے کھلے

تھے۔ درخواستوں پر یہ عبارت ضرور ہوتی تھی کہ میرا تعلق ایک شریف خاندان سے ہے۔

I COME FROM A RESPECTABLE FAMILY

شریفوں کے لئے مزدوری کر لینا یا اپنا ہی کام آپ کر لینا بڑی ذلت کی بات تھی۔ معمولی گٹھری بھی شرفاء اپنے ہاتھ میں نہیں لے جا سکتے تھے، وہ بھی مزدور اٹھاتا تھا۔ جو زیادہ شریف ہوتے ان کا لوٹا بھی نوکر پاخانہ میں رکھتے تھے۔ کسی کو برا کہنا ہو تو اس کو چمار کہہ دیتے یا دوسری برادریوں سے تشبیہ دے دیتے۔

دولت کی حد سے زیادہ نابرابری کسانوں، مزدوروں اور کاریگروں کو بہت قلیل معاوضہ، ذات پات کے سخت بندھنوں نے ملک کی قوت پیداوار پر ہی اثر نہیں ڈالا تھا بلکہ مذہب کی شکل بھی بدل ڈالی تھی۔ وعظ و نصیحت کا دروازہ تو کھلا تھا لیکن وعظ و نصیحت کرنے والے مولوی بھی شرفاء میں کچھ اچھی نظروں سے نہیں دیکھے جاتے تھے۔ اپنے بچوں کو قرآن وغیرہ دینی کتابیں پڑھانے کا معاوضہ بھی بہت کم دیتے تھے۔ سرکاری پیمانہ پر اصلاح کا کام کیا جائے یہ ممکن نہ تھا۔ سرکار اپنے ہاتھوں میں نہ تھی۔ غیر ملکی سرکار تھی۔ اسے زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہ تھی۔ وہ تو سماجی نظام کو بجنسہٖ باقی رکھنے کے حق میں تھی۔ ہندوستان کے بہی خواہوں نے سوچا کہ سرکار جب اپنی ہو گی تب ہی ہم سرکاری پیمانہ پر سماج کے سدھار کا کام کر سکیں گے اور ہمارا یہ کام مؤثر ہو گا۔ اس لئے وعظ و پند کے ساتھ آزادی کی تحریکیں اٹھیں، قوم کو جو وقتی شکایتیں ہوتی رہیں ان کو استعمال کیا گیا۔ جذبات ابھارے گئے۔ ہر طرح برطانوی سرکار کو پریشان کرنے کی کوششیں کی گئیں۔ حکومت نے حکمت عملی اور تشدد دونوں سے کام لیا اور جب دیکھا کہ آزادی کا نشہ ہندوستان گیر ہے اب یہ نشہ چڑھے ہی گا، اتریگا نہیں، ہندوستان پر حکومت کرنے کے لئے برطانیہ سے چند افسروں کا بھیجنا کافی نہ ہو گا اور بہت زیادہ بھیجنا ممکن نہ ہو گا، ہندوستانیوں کا تعاون

حسب ضرورت نہیں ملے گا، برطانیہ والے دوسری جنگ عظیم میں چور چور بھی ہو گئے تھے، ان کا اپنا ملک ہی ان کے لئے بھاری تھا تو ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان کی ذمہ داری ملک کے رہنما پنڈت جواہر لال نہرو اور ان کے رفقا کو سونپ دی۔

آزادی کے لئے نفسیاتی اور اعصابی جنگ اور کبھی کبھی اسلحوں کی جنگ برسوں رہی تھی، خود گاندھی جی نے ملک کی پچاس برسوں تک رہنمائی کی۔ کتنے تباہ و برباد ہوئے، کتنے آزادی کی حسرت دل ہی دل میں رکھے اللہ کو پیارے ہو گئے، جلاوطنی کی زندگی گذارتے رہے۔ ایک بزرگ کا قصہ ہے کہ وہ جزیرہ انڈمان میں، جسے کالا پانی کہا جاتا ہے، نظر بند تھے کیونکہ سرکار کے باغی تھے۔ ان کا آخر وقت تھا۔ مرض الموت میں مبتلا ہوئے۔ ایک سرکاری ملازم نے کہا کہ مولانا صاحب میں چھٹی میں وطن جا رہا ہوں، گھر والوں کو کوئی پیغام دینا ہو تو کہئے۔ بولے "انگریز ہندوستان سے چلے جائیں تو کوئی میری قبر پر آکر یہ خبر پہنچا دے۔"

مسلمانوں کو ہندوستان کی تباہی و بربادی کے علاوہ انگریزوں سے کچھ اور شکایتیں بھی تھیں۔ ان کی مسجدوں میں تالے لگ گئے تھے، ان کے بعض علماء کو قتل بھی کیا گیا تھا۔ ان کے مذہبی قوانین (پرسنل لاء) کو اینگلو اسلامی قوانین بنا کر نافذ کیا گیا تھا۔ ان کے بچوں کو سرکاری تعلیم گاہوں میں ان کی پرانی تہذیب سے برگشتہ کیا جا رہا تھا۔ اکبر الہ آبادی نے اس تہذیب کشی پر اشارہ کیا ہے۔

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

پھر ہندوستان پر قبضہ کرنے کے لئے عالم اسلام کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا تھا، خلافت عثمانیہ کو دم توڑ دینے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔ عربوں کی اس طرح چھوٹی چھوٹی سلطنتیں قائم کر دی گئی تھیں کہ وہ ہمیشہ کمزور رہیں۔ مزید یہ کہ ان کے سینوں پر فلسطین میں یہودیوں کو اور لبنان میں عیسائیوں کو مسلط کر دیا گیا تھا۔

فلسطین سے مسلمانوں کو بھگا کر اور یہودیوں کو بسا کر جو آج تک ہے۔ یہ غیر جمہوری نظام کا تسلط یورپ اور امریکہ کے ذریعہ تھا جو جمہوریت کے مدعی ہیں۔ چنانچہ ہندوستانی مسلمانوں کی ایک جماعت یہ سمجھتی تھی کہ انگریز ہندوستان سے چلے جائیں گے تو مسلمان ملکوں کے لئے آزاد ہونا آسان ہو جائے گا اور ایسا ہوا بھی۔

اگر مسلمانوں کا خود غرض طبقہ مسلمانوں کو ہندوؤں سے خوفزدہ کر کے بھٹکانے کی کوشش نہ کرتا تو مسلمان ہندوؤں سے زیادہ آزادی کی تحریک میں پیش پیش رہتے پھر بھی ایک گروہ تو آخر تک ساتھ رہا۔ حکومت کے تشدد کا شکار بھی ہوا۔ اور اپنوں یعنی مسلمانوں کی گالیاں بھی سنیں۔ بتائیے ان مسلمانوں کو اور جنگ آزادی کے سورما ہندوؤں کو کتنی خوشی ہوئی ہوگی جب ۱۵ اگست کا آفتاب آزادی کی خوشخبری لئے طلوع ہوا ہوگا۔ ایوان پارلیمنٹ میں انقلاب زندہ باد کی صدائیں گونج رہی تھیں۔ لال قلعہ پر ہندوستان کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ لاکھوں تماشہ دیکھنے جمع تھے، ہندوستان کے ہر شہر کو اس طرح سجا دیا گیا تھا کہ جیسے دلہن کو سجاتے ہیں۔ اس خوشی کے بیچ میں ایک آواز سنائی دے رہی تھی:

"مجھے آزادی کی خوشی نہیں ہوئی، میرے اندر سے زندہ رہنے کی تمنا مر چکی ہے۔"

یہ آواز آزادی کے سب سے بڑے رہنما کی تھی۔ یہ آواز گاندھی جی کی تھی آزادی کی لڑائی اس لئے لڑی گئی تھی کہ ہندو مسلمان چین سے رہیں۔ دونوں مل کر ملک کو ترقی کی طرف لے جائیں، ملک سرسبز و شاداب ہو، محبت کا پیغام بدیس تک پہنچائیں لیکن آزادی اس روپ میں کہ بھائی بھائی کا دشمن ہے۔ ہندو مسلمان کے درپے ہے۔ بے قصوروں کا گلا کٹ رہا ہے۔ عورتیں بے آبرو ہو رہی ہیں بچے تڑپنے کی مہلت بھی نہیں پاتے۔ مکانات جل کر سیاہ خاک ہو رہے ہیں۔ ملک کے بہادر، ملک کی حفاظت میں اپنے زور کو نہیں صرف کر رہے ہیں بلکہ ان پر

پاگل پن سوار ہے۔ گاندھی جی کے ذہن میں یہ نقشہ نہ تھا۔ اس لئے ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ وہ تڑپ اٹھے۔ لوگ خوشیاں منا رہے تھے وہ مغموم تھے۔ لوگوں کے چہروں پر رونق تھی، ان کا چہرہ پژمردہ۔ انہوں نے آواز بلند کی ظلم کے خلاف، درندگی کے خلاف، بے انصافی کے خلاف، یہاں تک کہ اسی کی گولیوں کا وہ نشانہ بن گئے۔

جو تجھ بن نہ جینے کو کہتے تھے ہم
سو اس عہد کو ہم وفا کر چکے

حب الوطنی یہ نہیں ہے کہ نگاہ گورنر کو بھانپ کر بولئے حب الوطنی یہ ہے کہ ملک کے حقیقی مفاد میں اس وقت بھی بولئے جب ظالم کے ہاتھوں موت آپ کے سر پر منڈلا رہی ہو۔

ہم مسلمانوں کو کہنا چاہتے ہیں کہ وہ اس ملک کو اپنا سمجھیں۔ وہ کریں جو اس ملک کے لئے بہتر سمجھیں۔ حاکموں کے ہاں میں ہاں ملانے کا طریقہ اختیار نہ کریں۔ کسی سرکاری پارٹی میں گھس کر اپنا سر نہ چھپائیں نہ قاتلوں کی پارٹی میں گھسنا اپنی نجات کے لئے مفید سمجھیں۔

گاندھی جی، جواہر لال نہرو، سردار پٹیل، مولانا آزاد یہ سب محب وطن تھے۔ یہ ایک دوسرے کی ہاں میں ہاں نہیں ملاتے تھے۔ یہ ایک دوسرے سے اختلاف بھی کرتے تھے اور اتفاق بھی۔ مولانا آزاد اور سردار پٹیل میں تو اتفاق ہوتا ہی نہیں تھا ہم بھی وہ کہیں اور وہ کریں جس میں ملک کا فائدہ ہو۔ کوئی ناراض ہو تو ہوا کرے۔

اپنے موقف پر غور کیجئے

کانگریس پارٹی نے اپنے انتخابی منشور میں یہ بتایا تھا کہ سیکولر اسٹیٹ کا یہ مطلب

نہیں کہ اسٹیٹ لامذہب ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ مذہبی معاملات میں
اسٹیٹ غیر جانبدار رہے گا۔ اگر یہی وضاحت دستور میں ہو جائے تو بہتر رہے گا۔
کیونکہ دستور میں وضاحت نہ ہونے کی وجہ سے بر سر اقتدار جماعت مذہبی امور میں
مداخلت کر رہی ہے۔ ہندو کوڈ بل کے ذریعہ ہندو دھرم میں ترمیمیں ہوئیں۔ تعلیم
گاہوں میں رام دھن کا گانا مسلمان بچوں سے بھی گوایا جاتا ہے۔ نصاب میں ایسی
کتابیں ہیں جن کے مضامین واقعات کے لحاظ سے غیر مستند اور ناقابل یقین ہیں۔
ان کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں معلوم پڑتا کہ مسلمان بھی برادران وطن کے ایک
فرقہ کی طرح توہم پرست بن جائیں۔ بکاشت زمینوں کی جو تجدید ہو رہی ہے اس سے
مسلم اوقاف پر اثر پڑے گا گرچہ خود غرض متولیوں نے اوقاف کو کچھ کم برباد نہیں کیا
ہے۔ راجستھان، بنگال، اور بعض دوسرے صوبوں میں مسلمان اپنی بہت سی
مسجدوں سے بے دخل ہیں۔

جب سیاست اس طرح مذہبی امور میں دخل دے تو مذہب والوں کو
سیاست میں دخل دینا ہی ہوگا یا مذہب سے دست بردار ہونا ہوگا۔

اربابِ سیاست سے ہماری گذارش ہے کہ وہ اپنے موقف پر غور
کریں اور وہ حدود قائم کریں جن سے آگے ان کو نہیں بڑھنا چاہئے۔ اگر ارباب سیاست
اس کے لئے تیار ہی نہ ہوں اور وہ تیار نہ ہوں گے تو مذہبی ہندوستان کو قدم آگے
بڑھانا ہوگا اور مذہبی ہندوستان کو اس کا حق ہے کیونکہ ملک کی بھاری اکثریت مذہب
کو مانتی ہے۔ غیر مذہبی حضرات قلیل التعداد ہیں اور وہ غیر جمہوری طریقوں سے اپنا
فیصلہ مذہبی ہندوستان پر لاد رہے ہیں۔ سب سے پہلے یہ ضروری ہوگا کہ مذہبی
ہندوستان اربابِ سیاست کے فریب نہ آئے اور بجائے اختلاف کے ایک متحدہ
محاذ پیش کرے۔ اگر ملک کی اکثریت دوسرے مذہب کو برداشت کر سکے تو وہ لادینیت
کے تسلط سے بچ سکتی ہے۔

جو حضرات مسلم جماعتوں کو سیاست سے علیحدہ رہنے کا درس دیتے ہیں

انہیں بتانا چاہئے کہ وہ مسلمانوں کو اور ان کے مذہب کو اہل سیاست کی دست درازیوں سے کہاں تک محفوظ رکھ سکتے ہیں۔

اپنی کتابوں کی حفاظت کیجئے

کسی صاحب نے اپنا پورا کتب خانہ خانقاہ رحمانی مونگیر کی لائبریری میں دے دیا ہے۔ اسی طرح اس سے قبل "دلینہ" کا پورا کتب خانہ ڈاکٹر ذاکر حسین کی سفارش پر خدا بخش لائبریری کے حوالہ کیا گیا۔ گیا کے مشہور قومی کارکن قاضی محمد حسین صاحب نے بھی اپنی کتابیں اسی خدا بخش لائبریری کو دے دیں۔

حقیقت میں جن لوگوں نے یہ کام کیا وہ دانشمند ہیں۔ ان لائبریریوں میں جہاں ان کی کتابیں منتقل ہوئیں زیادہ کثیر تعداد میں لوگ استفادہ کریں گے اور کتابیں زیادہ محفوظ رہیں گی۔

ہمارا مشورہ یہ ہے کہ ذاتی کتب خانے سرکاری کتب خانوں کے حوالہ کر دیئے جائیں یا ان اداروں کے کتب خانوں کی طرف منتقل کر دیئے جائیں جہاں کتابوں کی دیکھ بھال بہتر طریقہ پر ہوتی ہے۔ ذاتی کتب خانوں کی نگرانی مشکل ہے۔ کیڑے، دیمک، چوہے بری طرح کتابوں پر حملے کرتے ہیں۔ ہم نے اس طرح بڑے بڑے کتب خانے برباد ہوتے دیکھا ہے۔ پھر انسان نما درندے بھی کتابوں کے کچھ کم دشمن نہیں ہیں۔ ہندستان میں فرقہ وارانہ فسادات ہوتے رہتے ہیں۔ فسادی انسانی جانوں ہی کو برباد نہیں کرتے، وہ سسکتی ہوئی عورتوں اور بلبلاتے ہوئے بچوں ہی پر ظلم نہیں کرتے بلکہ وہ کتابوں کو بھی برباد کرتے ہیں۔ انہیں کیا معلوم ان کتابوں میں وہ مخطوطات اور نوادرات بھی ہیں جو لاکھوں روپے صرف کرنے پر بھی نہیں ملیں گے اور وہ ملک کی بہت قیمتی ملکیت ہیں۔ "نیمی" میں شوق نیموی کا عظیم کتب خانہ فسادیوں نے جلا دیا۔ اور نہ جانے

کتنے کتب خانے جلے ہوں گے اس لئے محفوظ طریقہ یہی ہے کہ جب دو چار سو کتابیں جمع ہو جائیں تو وہ کسی سرکاری کتب خانہ کو دے دی جائیں۔ کتابوں کے جمع کرنے میں کچھ کم روپئے نہیں لگتے ہیں۔ اگر ان کی حفاظت نہ ہوئی تو کتابیں دیمکوں، کیڑوں اور چوہوں کی نذر ہو گئیں تو اس حالت میں کم از کم اس کو جس نے خون جگر پی کر کے کتابیں جمع کی ہیں بڑا صدمہ ہو گا۔ پرائیویٹ طور پر کتابوں کی حفاظت میں بڑی محنت ہے جو ملازم پیشہ ہیں ان کے لئے تقریباً ناممکن ہے کیونکہ وہ برابر ایک جگہ نہیں رہ پاتے۔ برابر ان کو منتقل کیا جاتا ہے۔ اس لئے اپنے علمی اثاثے کو ضائع نہ ہونے دیں۔

فرقہ پرست جماعتوں پر پابندی

ہماری سرکار کے یہاں فرقہ پرست جماعتوں کی فہرست میں حسب ذیل جماعتیں شامل ہیں:۔

(۱) بھارتیہ جن سنگھ (۲) راشٹریہ سویم سیوک سنگھ

(۳) ہندو مہاسبھا (۴) مسلم لیگ (۵) جمعیۃ علماء

(۶) جماعت اسلامی (۷) تبلیغی جماعت (۸) امارت شرعیہ

اب اس فہرست پر نظر ڈالئے اور پھر اس تحریک پر غور کیجئے کہ فرقہ پرست جماعتوں کو اس بات کی اجازت نہ دی جائے کہ انتخابات میں حصہ لیں۔

انتخابات میں حصہ لینے والی جماعت ہندوؤں میں جن سنگھ اور ہندو مہاسبھا راشٹریہ سویم سیوک سنگھ کو انتخابات سے زیادہ شاید مسلمانوں کے قتل سے دلچسپی ہے۔ مسلمانوں میں مسلم لیگ انتخابات میں حصہ لیتی ہے اور سرکاری جماعت کانگریس سے اس کا میل رہتا ہے اور دونوں مل کر کرالا میں کمیونسٹ پارٹی کو بے دخل رکھتے ہیں۔ جمعیۃ علماء نے اعلان کر دیا ہے کہ وہ انتخابات میں حصہ نہیں لے گی۔ جماعت اسلامی ہندوستان کے انتخابات میں حصہ لینے کے خلاف ہے

تبلیغی جماعت کو سیاست سے دلچسپی نہیں. امارت شرعیہ انتخابات میں حصہ لینے کے خلاف تو نہیں ہے اور حصہ نہ لینے کا اس نے اعلان بھی نہیں کیا ہے لیکن آزادی کے بعد اس نے انتخابات میں کوئی حصہ نہیں لیا اور نہ اس میں اپنی کوئی دلچسپی دکھائی۔

گویا فرقہ پرست جماعتوں پر مذکورہ بالا پابندی کا نعرہ بھارتیہ جن سنگھ، ہندو مہاسبھا مسلم لیگ اور دوسری چھوٹی چھوٹی جماعتوں کے خلاف ہے جو انتخابات میں حصہ لینا چاہتی ہیں۔

اس تحریک کو قبول کرنے میں جو دستوری اور قانونی دقتیں ہیں جن کی وجہ سے اسے شرف قبولیت حاصل نہ ہو سکا اور وزیر قانون نے بھی اسے ناقابل عمل قرار دیا ان کے علاوہ حکومت اس لئے بھی اس طرح کا اقدام کرنے کی ہمت نہیں کرتی کہ ہندو رائے عامہ ممکن ہے مخالف ہو جائے اور مسلم لیگ سے اس کو امداد مل رہی ہے اس کے خلاف کیوں اقدام کرے۔ کانگریس تو اس تصادم کو بھول چکی ہے جو مسلم لیگ سے اس کا تھا مسلم لیگ کے جو بڑے بڑے لیڈر رہ گئے ان کو اس نے بڑے بڑے عہدے بھی دے دیئے۔

پھر یہ ہماری مشکلات کا کوئی حل بھی نہیں ہے۔ برادران وطن میں کچھ لوگ ہیں جو انتخابات جیتنے کے لئے فرقہ وارانہ اشتعال انگیزی کرتے ہیں لیکن وہ کسی بھی ٹکٹ پر کھڑے ہو سکتے ہیں۔ اگر ان کو ضرورت ہوگی تو وہ کانگریس ٹکٹ پر بھی کھڑے ہو جائیں گے۔ پلیٹ فارم بدلنے میں انہیں کوئی جھجک نہ ہوگی اور مسلمانوں کے خلاف ان کی اشتعال انگیزیاں جاری رہیں گی۔ اس لئے اصل کام یہ ہے کہ مسلمان، ہریجنوں، عیسائیوں اور دوسرے غیر فرقہ پرست ہندوؤں کا متحدہ محاذ بنایا جائے، فرقہ پرست عناصر کی غداریوں کو طشت ازبام کیا جائے۔ ان پر گنڈا ایکٹ نافذ کیا جائے اور ان کی اشتعال انگیزیوں پر ان کی قرار واقعی سزا کی جائے لیکن حکومت اس حد تک نہیں جانا چاہتی اس کے بعض لوگوں کی سب سے بڑی بد دیانتی یہ ہے کہ اس نے ہندو مہاسبھا اور مسلم لیگ

کی صف میں جمعیۃ العلماء، مسلم لیگ کو کھڑا کر دیا حالانکہ ہندو مہاسبھا اور مسلم لیگ وغیرہ جماعتوں نے اپنے فرقہ کے مفاد کو ملک کی آزادی اور ملک کے مفاد کے مقابلہ میں اپنے فرقہ کے چھوٹے چھوٹے مفادات کی پرواہ نہیں کی۔ ان دونوں موخر الذکر جماعتوں نے آزادیٔ وطن کے لئے تکلیفیں اٹھائیں۔ حقیقت میں مسلم لیگ کو چھوڑ کر کوئی بھی مسلم جماعت فرقہ پرست نہیں ہے۔ مسلم جماعتیں خالص مذہبی کاموں میں لگی ہوئی ہیں جس طرح گاندھی جی اور اور ان کے لوگ ہندوؤں کی اخلاقی بلندی اور رام راج کے لئے کوشاں رہے، اسی کی طرح یہ جماعتیں مسلمانوں کو اللہ کی عبادت کی طرف راغب کرتی رہی ہیں اور ان کی اخلاقی حالت کو سدھارنے میں لگی ہوئی ہیں۔

مسلمانوں کو مدافعت پر آمادہ کرنے کے لئے بھی کوئی جماعت کام نہیں کر رہی ہے۔ حالانکہ یہ حق مسلمانوں کو ملنا چاہئے کیونکہ حکومت مسلمانوں کی حفاظت میں ناکام ہے اور فسادیوں کا استیصال نہیں کر رہی ہے۔ موجودہ سیاسی پارٹیاں فسادیوں کا استیصال کر بھی نہیں سکتیں کیونکہ انہیں کرسیاں عزیز ہیں، یہ کام وہ کر سکتے ہیں جو یہ سوچ لیں کہ حکومت رہے یا نہ رہے لیکن ہندوستان کو سربلند ہونا ہے۔ یہاں شیر اور بکری کو ایک جگہ پانی پینا ہے یہاں محبت کو پھیلانا اور نفرت کو مٹانا ہے۔ ہندوستان میں ہر شخص کو جینے کا حق دینا ہے اور اس مقصد کے لئے مر مٹنا ہے۔

مشرک نہرو

پنڈت جواہر لال نہرو نے فرمایا کہ وہ مشرک ہیں اور انہیں فخر ہے کہ وہ مشرک ہیں اس کے باوجود کہ وہ کوئی مذہبی آدمی نہیں ہیں اس کے بعد انہوں نے شرک کا مفہوم بتاتے ہوئے فرمایا:

"نہ میں کسی کو اجازت دیتا ہوں کہ مجھ پر مسلط ہو اور نہ میں کسی پر مسلط ہونا چاہتا ہوں اور یہی شرک ہے۔"

انہوں نے بتایا کہ یورپ میں جو رواداری وہ حال کی پیداوار ہے

ورنہ زمانۂ سابق میں اس کا پتہ نہ تھا۔ کمیونزم یورپ کی اسی سابقہ روایات
کے مطابق ہے۔ ہندو روایت اس سے مختلف رہی ہے۔ یعنی اس کی روایت
مشرکانہ ہے۔ یہ ہر چیز قبول کر لینے اور اپنا لینے کے لئے تیار رہتی ہے
یہ ہر خیال کو برداشت کرتی ہے بشرطیکہ اس کے اپنے خیال کو صدمہ
پہنچے۔"

یہ بات تو صحیح ہے کہ یورپ میں ماضی میں رواداری نہ تھی لیکن اس کی وجہ
یہ ہے کہ یورپ والے پہلے مشرک تھے۔ جب انہوں نے اپنا مذہب بدلا تو اپنی
عدم رواداری کو ختم کرنے میں انہیں دیر لگی۔ گرچہ جواہر لال نے یہ سند دے دی ہے
کہ یورپ میں اب رواداری ہے لیکن حالات بتاتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے۔
ماضی میں دو بڑی لڑائیاں یورپ میں عدم رواداری کی شہادت دیتی ہیں۔ اسی طرح
اپنے ملک کے بارے میں بھی ان کا بیان صحیح نہیں۔ جب ہندوستان والے
صحیح مذہب پر قائم تھے تو ان کے اندر نہ شرک تھا نہ عدم رواداری اور جب امتدادِ زمانہ
سے ان کا مذہب بدل گیا تو ان میں شرک کے ساتھ عدم رواداری بھی پیدا ہو گئی
اگر وہ روادار ہوتے تو شودروں پر مندروں کے دروازے بند نہ ہوتے۔ ویدوں
کا سننا ان کے لئے ممنوع نہ ہوتا وہ ذلیل اور حقیر نظروں سے دیکھے نہ جاتے۔
کول اور بھیل اور سنتالوں کو جنگلوں کی راہ لینی نہ پڑتی۔ مذہبی کتابوں میں شودروں
کی توہین نہ ہوتی۔ آزادی کے زمانہ میں اور آزادی کے بعد مسلمانوں پر جو بیت رہی
ہے ہم اس کا تذکرہ کرنا نہیں چاہتے۔

ہر ملک میں شرک کی تاریخ یہی ہے۔ پیغمبر اسلام نے مشرکین عرب سے
عقیدہ ورائے کے اظہار کی آزادی ہی تو چاہی تھی لیکن وہ یہ آزادی دے نہ
سکے۔

حقیقت یہ ہے کہ کوئی مذہب کوئی دھرم آپس میں بیر رکھنا نہیں سکھاتا۔ وہ
تو رواداری اور محبت اور اختلاف کو برداشت کرنے کی تعلیم دیتا ہے لیکن یہ بات

ہر ملک کے اصل مذہب میں ہے۔ شرک اصل مذہب سے علیحدہ ہے۔ شرک اور عدم رواداری بعد کی پیداوار ہے اور یہ مشرک ہیں جو مذہب کو بدنام کرتے اور اس کا حلیہ بگاڑتے ہیں اور اختلاف مذاہب اور آزادی رائے کو برداشت نہیں کرتے غالباً انہی کے اثر سے ہندوستان کے دستور میں یہ دفعہ رکھی گئی ہے کہ ملک میں یکساں سول کوڈ ہوگا جس کا مطلب یہی ہے کہ وچاروں اور خیالات کے اختلاف کی وجہ سے جو طرح طرح کے مذاہب ہیں ان کو برداشت نہیں کیا جائے گا اور ان کی رعایت سے جو مختلف سول کوڈ ہیں ان کو ختم کر کے ایک سول کوڈ سب پر تھوپ دیا جائے گا۔ اس مشرکانہ غیر روادارانہ تصور کی وجہ سے دستور میں اس کی وضاحت نہیں کی گئی ہے کہ حکومت تمام مذاہب کا احترام کرے گی اور سب کو اس کا موقع دے گی کہ وہ اپنا مذہب جانیں اور اس پر عمل کریں حالانکہ ملک کی بھاری اکثریت مذہبی ہے یعنی مذہب کو مانتی ہے۔ ہمارے لیڈر کہتے ہیں کہ سیکولر حکومت ایسی حکومت کو کہتے ہیں جو کسی ایک مذہب کے ساتھ امتیازی سلوک نہ کرے۔ اگر اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر مذہب کو بڑھنے اور ترقی کرنے کا موقعہ دیا جائے گا اور کسی کے راستہ میں رکاوٹ نہیں پیدا کی جائے گی تو اس کی وضاحت دستور میں ہونی چاہئے اور اگر امتیازی سلوک کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ایک مذہب کو باقی رکھا جائے اور باقی کو مٹا دیا جائے۔ ایسا نہ ہوگا بلکہ سب ہی کو مٹا دیا جائے گا تو مذہبی ہندوستان کو اس کی مخالفت کرنی چاہئے۔

ہم نے آزادی کے حصول کے لئے جنگ لڑی تھی تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہ تھا کہ اپنے ہاتھوں اپنے مذہب کو مٹائیں گے بلکہ اس لئے جنگ کی تھی کہ جمہور کے منشاء کے مطابق عمل ہو گا جس کی غالب اکثریت مذہبی ہے۔ جمہوریت میں اختلافِ خیال کو برداشت کرنے کی گنجائش ہے، یہاں سب مذہب پنپ سکتے ہیں، سب ہی مذہب کے ماننے والوں کی حکومت اور یہی سب ہی فرقوں کو اپنے اپنے مذہب پر عمل کرنے کی آزادی ہوگی۔ مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد نے ایک جلسہ میں جو ہندو مسلم اتحاد پر غور کرنے کی غرض سے منعقد ہوا تھا یہ کہا تھا کہ ہندو مسجدوں کی اور مسلمان مندروں

کی حفاظت کریں۔ آزاد ہندوستان میں جو جناح صاحب کی رائے سے بنا، مندروں کی حفاظت کی ضرورت نہیں رہی لیکن مسجدوں کی حفاظت کی ضرورت ہے۔ بہر حال دنیا میں روز انقلابات آتے ہیں ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ مندروں کی حفاظت کی ضرورت پڑے۔ اسی طرح مولانا عبید اللہ سندھی نے کہا تھا کہ آزاد ہندوستان میں ہندوؤں کے لئے ان کے مذہبی قوانین اور مسلمانوں کے لیے ان کے مذہبی قوانین کا نفاذ ہونا چاہیے لیکن ایسا نہیں ہوا اور ہم سیکولرزم پر زور دیتے رہے جس کی وضاحت دستور میں نہیں ہے گوپال متل نے لکھا تھا کہ ہمیں سیکولرزم پر زور نہیں دینا چاہئے کہ اس میں اختلاف مذاہب کو برداشت کرنے کا جذبہ نہیں ہے۔

وقت آگیا ہے کہ تمام وہ ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی پارسی وغیرہ جو مشرک نہیں ہیں، اختلاف مذاہب سے بیزار نہیں ہیں، جمہوریت اور رواداری کے حامی ہیں، اس صورتحال پر سنجیدگی سے غور کریں اور ایک ایسی حکومت کے قیام کی کوشش کریں جو مشرک نہ ہو، اختلاف مذاہب سے بیزار نہ ہو اور ملک میں امن وامان کے قیام پر سب سے زیادہ زور دینے والی ہو۔

ہم بلاشبہ ایک مذہب کے قائل ہیں۔ ہم یگانگت اور یکسانیت کو پسند کرتے ہیں۔ ہم انسانوں کو ٹکڑوں اور گروہوں میں تقسیم کرنا نہیں چاہتے لیکن ہم یہ چاہتے ہیں کہ انسان بہ سلامتی ہوش وحواس بلا جبر واکراہ سمجھ بوجھ کر ایک مذہب پر جمع ہو یہ نہ ہو کہ کسی فرقہ یا جمہور کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر کوئی تصور حیات یا کوئی قانون ملک پر تھوپ دے۔ ایسا کرنا اہنسا اور عدم تشدد کے خلاف ہوگا۔ جب یکساں سول کوڈ اور سیکولر حکومت کا تصور دستور میں داخل کیا جا رہا تھا تو کیا یہ واقعہ نہ تھا کہ ان اہم مسائل پر رائے عامہ کو بیدار نہیں کیا گیا تھا۔ بے شعوری کے عالم میں ایک خیال کو ترک کر کے دوسرے خیال کو اپنے اوپر لاد لینا مستحسن نہیں ہے۔ بے شعوری میں متضاد خیالات ذہنوں میں چھا جاتے ہیں۔ توحید بھی، شرک بھی، لادینی بھی اور نہ جانے کیا کیا۔

دستور ساز اسمبلی میں جب یکساں سول کوڈ کی دفعہ آئی تھی تو راقم الحروف نے
روزنامہ الہلال میں پٹنہ اس کے خلاف آواز اٹھائی تھی۔ لیکن وہ آواز صدا بصحرا ثابت
ہوئی اس وقت ایک طبقہ فساد کرنے میں مشغول تھا، دوسرا طبقہ جان بچانے میں اور
تیسرا طبقہ لوگوں کو غافل پاکر اپنے خیالات ملک پر تھوپنے میں۔

اجلاس کانگریس سے ایک سبق

پٹنہ میں کل ہند کانگریس کا اجلاس (غالباً ۱۹۶۱ء) میں ہوا تھا۔ شرکاء کی تعداد
کا اندازہ کم از کم تین لاکھ بتایا جاتا ہے اور زیادہ سے زیادہ دس لاکھ۔ گویا پٹنہ کی جتنی
آبادی ہے اتنی ہی دوسرے شہروں سے امنڈ کر چلی آئی تھی۔ ان نوواردوں کو نہ منظم
کرنے کی کوشش کی گئی اور نہ ان کی خود منظم ہو کر یکجا ہونے کی عادت تھی۔ نتیجہ کیا ہوا
کہ بڑے بڑے لیڈران کو قابو میں رکھنے میں ناکام ہو گئے۔ مجمع حامیوں کا تھا، مخالفوں
کا نہ تھا لیکن یہ بھی سیلاب کی طرح خوفناک بن گیا۔ لیڈروں کی جان بھی محفوظ نہ
تھی۔ وزیر اعلیٰ زخمی ہو کر گر پڑے تھے اور اٹھا کر کنارے کیے گئے تھے۔ پچاسوں
کی تعداد ایسی تھی جو بیہوش ہو کر گری۔ بھاگنے کو راستہ نہ تھا۔ لوگ کراہتے اور
چیختے تھے اور مدد کے طالب ہوتے تھے۔ جیسے کوئی حملہ آور ہو اس سے پناہ مانگی
جائے۔ ایک گروہ دیواروں کو توڑنے کی کوشش کر رہا تھا کہ بھاگ سکے۔ چیخ وپکار
اور دیواروں سے ٹکرانے کی وجہ سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ مجبوراً
پہلے دن کا اجلاس ملتوی کرنا پڑا۔ یہ مثال ان کے لئے خوب ہے جو نظم وضبط اور
اجتماعی زندگی کے حامی نہیں ہیں۔ کانگریس پنڈال میں ایک خیال کے لوگ اکٹھے
ہوئے اور پھر بھی ایک دوسرے کے لئے خطرناک بن گئے اسی طرح جب ایک
خیال اور ایک مقصد کی قوم جب منظم نہیں ہوتی ہے تو اپنے آپ کو روندتی اور
برباد کرتی ہے۔ دور کیوں جائیے، اسی ہندوستان کے مسلمان کو ہی لے لیجئے

ان کا عقیدہ ایک، ان کی تہذیب ایک، ان کی زبان ایک (جہاں تک بہار یوپی اور بعض دوسرے حصوں میں بسنے والوں کا تعلق ہے)، ان کا مفاد ایک، ان کا دشمن بھی ایک، لیکن ان کے دشمنوں کی انگلیاں بھی ٹیڑھی نہیں ہوتیں، اغیار پر یہ اثر بھی نہیں ڈال سکتے کہ ان سے ان اغیار کو فائدہ پہنچ سکتا ہے اس لئے ان کی قدر کرنی چاہئے۔ حالانکہ ان مفید ہونا تاریخی حقیقت ہے۔ اس کے برعکس ہو یہ رہا ہے کہ یہ آپس میں دست گریباں ہیں۔ ایک دوسرے کی ٹوپیاں اچھال رہے ہیں۔ ہر شخص ایک دوسرے کی عزت برباد کرنے پر تلا ہوا ہے۔ یہ ٹکراؤ صرف ان میں نہیں ہے جو غیر مذہبی ہیں بلکہ مذہب کے ہم نواؤں بلکہ مذہب کے پیشواؤں میں بھی ہے۔ گویا اسلام اس لئے آیا تھا کہ وہ اسلام کا نام لینے والوں کو جدا جدا کر دے اور ان کو ایک دوسرے کا دشمن بنا دے۔ ان میں رواداری اور محبت کی جگہ عدم رواداری اور مخاصمت پیدا کر دے۔

اسلام نے اجتماعی زندگی پر بہت زور دیا ہے۔ اس کی عبادت نماز کے اجتماعات میں لاکھوں افراد شریک ہوتے ہیں لیکن ایسا نظم وضبط ہوتا ہے کہ کسی کو کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوتا۔ ہر سال خانۂ کعبہ کے گرد بیس لاکھ مسلمان پانچ وقت جمع ہوتے اور نمازیں پڑھتے ہیں لیکن نہ کوئی کسی کو کچلتا ہے نہ کسی کو دھکے دیتا ہے۔ سب ایک امام کے پیچھے نماز کے ارکان ادا کرتے ہیں۔ امام سجدے میں جاتا ہے تو سب سجدے میں جاتے ہیں۔ امام رکوع میں جاتا ہے تو سب رکوع میں جاتے ہیں۔ امام کھڑا ہوتا ہے تو سب کھڑے ہوتے ہیں، امام بیٹھتا ہے تو سب بیٹھتے ہیں امام سلام پھیرتا ہے تو سب سلام پھیرتے ہیں۔ امام قرأت کرتا ہے تو سب خاموشی سے کھڑے سنتے ہیں۔ امام خطبہ دیتا ہے تو اس وقت بھی کسی کو کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوتا، سب لوگ امام کی طرف متوجہ ہو کر اس کی باتیں سنتے ہیں۔ جلسوں میں نظم وضبط کا اس سے سبق لیا جائے تو اس طرح دھینگا مشتی نہ ہو۔ یہ نہ سمجھئے کہ صرف نمازوں میں ایسی بات ہو سکتی ہے۔ اگر ہم نمازوں کا صحیح اثر لیں تو غیر نماز میں بھی یہ ہو سکتا ہے۔ خود ہندوستان میں تبلیغی اجتماعات ہوتے ہیں اور بغیر اشتہار اور

اعلان، بغیر ریڈیو اور ٹیلی ویژن، اور بغیر اخبارات کی مدد کے دس دس لاکھ آدمی جمع ہو جاتے ہیں لیکن ان میں وہ واویلا نہیں ہوتا جو کانگریس کے اجتماع میں ہوا۔ اصل چیز ہے اجتماع کا احترام، خاموش ہو کر امام کی بات سننے کا جذبہ، کسی کو اذیت نہ دینے کی تمنا، لوگوں کی مدد کرنے کی کوشش۔ یہ چیزیں نہ ہوں گی تو فوج اور پولیس بھی امن قائم نہیں رکھ سکتی۔ حج میں مسلمان ارکان بھی ادا کرتے ہیں مثلاً طواف اور کنکریوں کا مارنا لیکن ان میں وہ نظم نہیں ہوتا جو نمازوں میں ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان امور میں لوگوں کو پریشانیاں ہوتی ہیں۔ اگر ان کاموں میں بھی نظم و ضبط پیدا کر دیا جائے تو ان میں بھی لوگوں کو کوئی خطرہ نہیں رہے گا۔

تنظیم تو اجتماع کی جان ہے جس پر اسلام نے بہت زور دیا ہے۔ نبی برحق مبعوث ہوئے تو آواز دی امنوا باللہ واطیعون۔ اللہ پر ایمان لاؤ اور میری اطاعت کرو۔ اس اطاعت کے لئے انگریزی کا لفظ ڈسپلن ہے۔ زمانہ سابق میں اس نظم اور ڈسپلن کو جس طرح باقی رکھا گیا اس پر بحث بے سود ہے کیونکہ وہ حالات اب موجود نہیں لیکن سوال یہ ہے کہ یہ نظم اور یہ ڈسپلن کس طرح پیدا ہو۔ ظاہر ہے کہ اس کی صورت اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہمارا ایک امیر ہو جس طرح گرو چیلوں (DISCIPLES) پر شفقت کرتا اور چیلے گرو کی عزت کرتے اور سب مل کر اس طرف متوجہ رہتے ہیں اسی طرح مامور امیر کی طرف متوجہ ہو اور اس کے کہے پر چلے اور مامورین ایک دوسرے کی مدد کریں اور خوب احتیاط برتیں کہ ان سے کسی دوسرے مامور کو کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ امیر کی ایسی اطاعت ہونی چاہیئے کہ وہ کہے چلو تو سب چلنے لگیں وہ کہے ٹھہرو تو سب ٹھہر جائیں۔ وہ کہے خاموش تو قبرستان کا سناٹا چھا جائے وہ کہے بولو تو بادلوں کی کڑک بھی ہیچ ہو جائے۔

سماج کو بدلنے کی ضرورت

ہم بازار جاتے ہیں۔ دیکھتے ہیں بنیا ڈنڈی مار رہا ہے، خراب مال کو اچھا کہہ کر بیچ رہا ہے۔ مارواڑی کپڑے دیتا ہے تو ناپ میں تھوڑا کم دیتا ہے اور خریدار کی آنکھوں میں دھول ڈال کر اس پر یہ اثر ڈالتا ہے کہ وہ کپڑے پورے دے رہا ہے ہم سرکاری دفاتر میں جاتے ہیں تو پاتے ہیں کہ ملازمین رشوت لیتے ہیں۔ اب تو رشوت خوری نے اتنی ترقی کی ہے کہ اسمبلی کی ممبری اور وزارتوں کے لئے بھی لوگ رشوت دیتے ہیں۔ ابھی ہم سے کانسل کے ایک معزز ممبر نے کہا کہ..... صاحب کے پاس جو پارلیمنٹ کی ممبری کے امیدوار ہیں روپے نہیں ہیں ورنہ فی ممبر ایک ہزار روپیہ دے دیتے انہیں دس ووٹ مل ہی جاتے، جو کم پڑ رہے ہیں۔ ہم نے ہنس کر کہا کہ بڑے باوقار ہیں آپ کے ممبران۔ اس پر انہوں نے جواب دیا کہ لوگ پارلیمنٹ کے ممبر بن کر پانچ سال میں پچاس ساٹھ ہزار روپئے کمائیں گے تو کیا ان کو اپنے انتخاب میں دس بیس ہزار روپئے نہیں خرچ کرنا چاہئے۔

اسی طرح دیہاتوں میں جائیے، وہاں کسان دوسرے کسان کی زمین دبا رہا ہو گا جو اس کے کھیت سے ملی ہوئی ہو گی۔ ہم دودھ لیتے ہیں، دودھ والا دودھ میں پانی ملا کر دیتا ہے۔ گھی خریدتے ہیں تو نہیں کہہ سکتے کہ گھی ہے یا ڈالڈا۔ حتیٰ کہ راشن کے غلوں میں بھی دھوکا ہے۔ آجر مزدوری دیتا ہے تو کوشش کرتا ہے کہ پوری مزدوری نہ دے اور کام زیادہ لے۔ مزدور کام کرتا ہے تو چاہتا ہے کہ کام کم کرے اور مزدوری زیادہ لے۔ اسکولوں میں جائیے تو دیکھئے گا کہ ماسٹر پڑھاتے نہیں ہیں۔ جنکو پڑھنا ہے وہ ٹیوشن پڑھتے ہیں۔ جو ٹیوشن نہیں پڑھتے وہ جاہل رہتے ہیں نقل کر کے امتحان پاس کرتے ہیں، جھوٹی ڈگریاں لیتے ہیں، اسکول صرف کھیل کود کے لئے جاتے ہیں۔ ماسٹر صاحب کو جو اسکول سے ملتا ہے وہ نہیں سمجھتے کہ یہ ان کے

لئے حرام ہے اگر وہ نہیں پڑھاتے ہیں۔
لوگ دکھی ہیں لیکن اسی ٹیڑھے راستے پر چلے جا رہے ہیں شکایتیں کرتے ہیں جب ان کو دکھ پہنچتا ہے لیکن جب اپنی باری آتی ہے تو دوسروں کو دکھ پہنچانے سے دریغ نہیں کرتے۔ اسی سماج میں ہمارا رہنا ہو رہا ہے ہم اس کو بدلیں تو مٹ جائیں گے۔ خدا ہم پر رحم نہیں کرے گا۔ یہ جو امریکہ کی دولت آرہی ہے اس سے دھوکا نہیں کھانا چاہیئے۔ یہ تو بجلی کی چمک ہے، مستقل روشنی نہیں ہے۔ آسمان پر بادل چھا جائے تو کسان کو بہت ڈھارس ہوتی ہے لیکن بدلیاں کبھی تو بے برسے ہی ادھر ادھر چلی جاتی ہیں اور کبھی اتنے زور کی بارش آتی ہے کہ سیلاب آجاتا ہے۔ فصلیں تباہ ہو جاتی ہیں، مکانات گر جاتے ہیں۔ مویشیوں اور خود کسانوں کی جان چلی جاتی ہے۔ اس لئے عقل مند بارش کے موسم سے پہلے اپنے رہنے کے مکانات کو مضبوط بنا لیتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ کمزور مکان موسلا دھار بارش میں تھم نہیں سکتے۔
اسی طرح کمزور سماج ہو تو اس کے لئے دولت کی بارش زحمت ہے، رحمت نہیں امریکا کی دولت کی بارش اسے بچا نہیں سکتی۔ سماج کے ضعف اور قوت کا مدار روحانیت پر ہوتا ہے، دلوں کی پاکیزگی پر ہے، بے نفسی اور ایثار پر ہے نہ کہ دولت اور حکومت پر۔ دولت و حکومت کی مثال تو تلوار کی ہے۔ تلوار دو دشمنوں کو دے دیجئے، دونوں کٹ مریں گے لیکن دو نیک نفس باہم محبت کرنے والے تلوار کے قبضہ پر ہاتھ رکھیں گے تو ایک دوسرے کی حفاظت کرنے کے لئے۔ دونوں مل کر انسانیت کے دشمنوں سے لڑیں گے، ان دشمنوں سے جو سماج کو برباد کر رہے ہیں۔ اس طرح ان میں طاقت آئے گی۔ ہمارا کہنا یہ ہے کہ سماج کو طاقتور بنانے کا راستہ یہ نہیں ہے کہ ڈالر اور اشرفیاں لاکر ہندوستان میں ڈھیر کر دیں۔ بلاشبہ ڈالر اور اشرفیاں فائدہ مند ہیں لیکن جس کو بخار چڑھ رہا ہو اس کو مرغ مسلم نہیں کھلائینگے حالانکہ مرغ مسلم کے طاقتور غذا ہوتے سے کسی کو انکار نہیں۔ اسی طرح خود غرض بد نیت اور حاسد سماج میں سونے کے سکے جمع کرنا خطروں کا پیغام ہے۔ یہ سماج تو دنیا کو تباہ کرنے کیلئے ان سکوں کو استعمال کریگا۔

جَاهِدُوا فِی اللّٰہِ حَقَّ جِھَادِہٖ

تقریباً ہماری پوری قوم سستی اور کاہلی میں زندگی گذارتی ہے۔ اچھے اور صالح مقصد کے لئے جدوجہد کی اس کو فکر نہیں ہے۔ جہاں دیکھئے مجلسیں جمع ہیں۔ کوئی بڑی پی رہا ہے کوئی حقہ کے کش لے رہا ہے، کوئی تاڑی (سینڈھی) اور شراب سے محظوظ ہو رہا ہے کوئی ناچ اور رنگ میں مشغول ہے، کوئی تاش اور شطرنج کھیل رہا ہے۔ کوئی سینما ہال میں ہے کوئی فٹ بال کے کھیل کے گرد کھڑا ہے۔ غرض کہ وقت کی کوئی قیمت ہے تو یہی کہ ان بیکار کاموں میں مصروف ہو یا خوش گپیاں کی جائیں یا خوابِ شیریں میں محو رہا جائے۔ اچھی زندگی بنانے کے لئے کوشش، جدوجہد، تگ ودو پیش نظر نہیں ہے۔ قدم اٹھتے ہیں تو مجبوری میں ہاتھوں کو حرکت ہوتی ہے تو لاچاری میں انشراح کے ساتھ ہنسی خوشی کے ساتھ نہیں۔ اس ولولہ اس جوش میں نہیں کہ ہم اپنے ساتھیوں کی اور نوخیز وہم عمر جوانوں کی زندگی سنواریں۔ حالانکہ زندگی کی کامرانیاں ان کے لئے ہیں جو جہاد مسلسل میں مست ہیں، اپنی اصلاح کے لئے، اپنے گردوپیش کی اصلاح کے لئے اور آنے والی نسلوں کو بہتر نمونہ دینے کے لئے بےچین ہیں اور اس میں مجاہد کا اور سعی وکوشش کرنے والوں کا فائدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے "من جاھد فانما یجاھد لنفسہ" جو جہاد کرتا ہے وہ اپنے لئے ہی کرتا ہے اور یہ بشارت دیتا ہے کہ اس کا جہاد، اس کی تگ ودو اگر لوجہ اللہ ہے یعنی اللہ کی خوشنودی کے لئے ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو کامیاب وسرفراز فرمائے گا۔ بحکم "الذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا" جو ہماری راہ کی تلاش میں کوشش کرتے ہیں، ہم انہیں اپنا راستہ دکھاتے ہیں۔

پہلا کام اپنی اصلاح ہے، اپنے کو سنوارنا ہے، اپنی زندگی کو بنانا ہے۔

اس لئے جہاد بھی اصل وہی ہے جو اپنے نفس سے کی جائے، اپنی خواہشات پر غالب آیا جائے، اپنے غیض وغضب کو مغلوب کردیا جائے۔ جو چیز اپنے نفس کو بھلی نہ لگے لیکن عنداللہ وہ بھلی ہو اس کو اختیار کیا جائے اور جو چیز اپنے نفس کو بھلی لگے لیکن عنداللہ وہ بری ہو اس کو اختیار نہ کیا جائے۔ معمولی جہاد یعنی کوشش سے انسان میں اس کی قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ گردوپیش کو متاثر کرے اور اس کے لئے بھی جہاد کرے کیونکہ گردوپیش خراب حال میں ہوں گے اپنے نفس کے متاثر ہو جانے کا خطرہ ہے۔ اگر گردوپیش یعنی ماحول کو بدلنے میں کامیابی نہ دکھائی دے تو مایوس نہیں ہونا چاہئے بلکہ استقامت کے ساتھ جہاد اور تگ ودو کو جاری رکھنا چاہئے اور نمازوں میں اللہ تعالیٰ سے استقامت فی الجہاد اور کامیابی کی دعا بھی کرنی چاہئے کیونکہ بغیر نصرت الٰہی اور رضائے الٰہی کامیابی محال ہے۔

بعض اوقات حکومتیں بھی غیر عادل سماج بنانے کی ذمہ دار ہوتی ہیں۔ ایسی صورت ہو تو افضل جہاد یہ ہے کہ سلطان جابر کے سامنے کلمۂ حق ادا کرنے سے باز نہ رہیں اور جو نتائج ہوں ان کو مردانہ وار بھگت لیں۔ جمہوری حکومتیں اعلائے کلمۃ الحق کی اجازت دیتی ہیں۔ پریس اور پلیٹ فارم سے آواز حق بلند کر سکتے ہیں لیکن افسوس ہم تھوڑے سے فائدہ کے لئے حکومت پر تنقید کرنے سے گھبراتے ہیں۔ اگر سماج بے انصافی اور برائی کا حکم دے تو اس حکم کو نہ ماننا جہاد کبیر ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: "فلا تطع الکافرین وجاھدھم جھادا کبیرا" کافروں کا کہنا نہ مانو اور جہاد کرو ان کے ساتھ بڑا جہاد۔ یہاں پر جہاد کے معنی قتال نہیں ہیں بلکہ نہ ماننے کے نتائج کو بھگتنا اور حق کی حمایت میں استدلال کرنا ہے کیونکہ یہ اس وقت کی آیت ہے جب قتال کا حکم نہیں ہوا تھا۔ اس کو جہاد کبیر اس لئے کہا گیا کہ تصادم بگڑے ہوئے سماج سے تھا اور تصادم کی شکل یہ تھی کہ بگڑے ہوئے سماج کے ارکان (کفار) مسلمانوں کو تکلیف دیتے تھے کہ وہ اپنی دعوت کا کام نہ

کریں اور مسلمانوں کا کام سہہ لینا، انتقام نہ لینا اور نرمی سے اپنی دعوت پیش کرتے رہنا تھا۔ ظاہر ہے اس میں بڑے صبر، بڑے تحمل اور بردباری کی ضرورت تھی۔ حکم ہوا کہ کفار کا کہنا مان کر اپنی دعوت سے باز نہ آجاؤ اور ان کی دی ہوئی اذیتوں کو مردانہ وار سہہ لو۔

غرض جاہدوا فی اللہ حق جہادہ (جہاد کرو اللہ کی راہ میں جس طرح جہاد کرنے کا حق ہے) کا حکم عام ہے۔ اس کی ابتدا اپنے نفس کی اصلاح سے ہوتی ہے اور اہل وعیال کی اصلاح سے لے کر سماج اور حکومت کی اصلاح تک اس کا دائرہ وسیع ہو جاتا ہے۔ ان نیک مقاصد کے لئے ہر طرح کی کوشش، ہر طرح کی جدوجہد "جہاد حقہ" میں داخل ہے۔ بری بات سے اپنے جی کو دبا لینا بھی جہاد ہے۔ زبان کو حرکت دے کر کسی کو غلط راستہ سے روک دیجئے تو یہ بھی جہاد ہے۔ کسی کے مقدس ہاتھ برائی کو روکنے کے لئے بڑھ جائیں تو یہ بھی جہاد ہے۔ اگر نیک مقصد کے لئے اپنا مال، اپنا وقت صرف کریں تو یہ بھی جہاد ہے۔ اگر اس راہ میں اپنی جان دے دیں تو یہ بھی جہاد ہے اور جو ہم سے لڑیں اور بے قصور ہمیں ہمارے گھروں سے نکالیں اور ہمیں عبادت کی آزادی نہ دیں تو ہمارا ان سے اس وقت لڑنا بھی، تاکہ فتنہ باقی نہ رہے، جہاد ہے۔

مختصر یہ کہ زندگی کی جو اللہ نے بخشی ہے، قیمت یوں ادا کرنا ہے کہ اپنے کو اور نوع انسان کو محبت اور آشتی سے لوجہ اللہ سدھارنے کے لئے مسلسل جدوجہد اور پیہم تگ ودو کیجئے۔ اس زندگی کے اوقات کو چھوٹے اور بے مقصد کاموں میں نہ گنوائیے۔ جہاد، سستی اور کاہلی کی ضد ہے۔ یہ ہمارے اختیار میں ہے کہ ہم سستی اور کاہلی کو اختیار کریں یا جہاد اور سعی مسلسل کو۔ جہاد یہ ہے کہ ہم آگ بنیں جو باطل کی ہر چیز کو جلا دے۔ کاہلی سوکھی لکڑیوں کی مانند ہے جو آگ میں جل کر راکھ ہو جاتی ہے

اے ہماری قوم! سستی اور کاہلی کو اور وقت کو بے کار تعیش میں صرف کرنا چھوڑ دے۔ اہلِ حق کے حق کو ادا کرنے کے لئے تگ ودو اور کوشش، محنت اور جہاد کو اپنا شعار بنا۔ خود طاقتور بن اور دنیا کے نیک لوگوں کو طاقتور بنا تاکہ یہ دنیا انسان کے لئے جنت بن جائے اور آخرت کی جنت کا بھی وہ مستحق ہو جائے۔

خیر الامور اوسطہا

انگریز ہندوستان آئے اور حاکم بنے تو ہمارا ملک ان سے ذہنی طور پر بہت مرعوب ہو گیا۔ ہمارے اچھے اچھے اصحابِ فکر غیر ضروری امور میں ان کی پیروی کرنے لگے۔

جب کوئی چوٹ لگے تو ہمیں یہ سوچنا چاہئے کہ یہ چوٹ کیوں لگی۔ چوٹ دینے والا ہم سے کن کن باتوں میں مضبوط ہے اور ہم چوٹ کھانے والے کس کس طرح کمزور ہیں خوب غور و فکر کر کے اپنی کمزوریاں دور کرنی چاہئیں۔ لیکن عام انسان سوچنے کے عادی نہیں ہیں۔ وہ جانوروں کی طرح بے سوچے ہی آگے بڑھتے ہیں اور چوٹ لگتی ہے تو پیچھے بھاگتے ہیں۔ یہی حال ہندوستان والوں کا ہوا بالخصوص ہندوستان کے مسلمانوں کا۔ ہم نے انگریزوں کی تہذیب پر تنقید کی نگاہ نہیں ڈالی۔ یہ نہیں کیا کہ ان کی اچھائیاں لے لیں اور ان کی برائیاں چھوڑ دیں۔ ہم نے تو ان کی بری باتوں کو اچھا جانا۔ صاحب کی جو بات بھی دیکھی اس کی نقل اتاری۔ اس خو نے ہمارے اندر بہت ساری بری باتیں ہی نہیں پیدا کر دیں بلکہ ہماری تہذیب میں انتشار بھی پیدا کر دیا۔

ہم مسلمانوں میں ایک گروہ اور تھا۔ وہ تعصب اور نفرت کا شکار تھا۔ اس نے یورپ کی اس پیروی کے خلاف احتجاج کیا۔ اس یورپ میں کوئی بھلی بات ہی نظر نہیں آئی۔ ہندوستانی مسلمانوں کے ان دونوں گروہوں کا ایک عرصہ تک باہم تصادم رہا۔ پہلا گروہ کہتا تھا کہ ہمیں تعصب کو چھوڑ کر ترقی کرنے والی قوم کے پیچھے چلنا چاہئے تاکہ جس طرح انہوں نے ترقی کی ہے ہم بھی ترقی کریں۔ اس گروپ کے باقیات میں عنایت اللہ مشرقی صاحب نے تو یہاں تک مبالغہ کیا کہ اس یورپ کی قوم کو اللہ کی چہیتی امت کہا کیونکہ کوئی قوم ترقی کرے تو ثابت ہوا کہ وہ اللہ کے انعام و اکرام کی مستحق بن گئی ہے دوسرا گروہ کہتا تھا کہ دوسروں کی تہذیب اختیار کرنے سے ہمارا وجود ختم ہو جائے گا۔ احساس کمتری میں مبتلا ہو کر

کسی قوم نے ترقی نہیں کی ہے۔ ہم ہر طرح یورپ والوں سے فائق و برتر ہیں۔ ہمیں اپنے تہذیبی ورثہ پر فخر کرنا چاہئے اور اس کی حفاظت کرنی چاہئے۔

آج تک اس تصادم کا فیصلہ نہ ہوا لیکن یوروپین تہذیب نفوذ کرتی رہی اور کوئی شک نہیں کہ ہندو مسلمان تعلیم یافتہ حضرات کا بڑا حصہ اس گرفت میں ہے۔ وہ بھی جو تعصب اور نفرت کی بنیاد پر یورپی تہذیب کی افادیت کے یکقلم منکر تھے غیر شعوری طور پر یورپی تہذیب کے بہت سے گوشوں کو قبول کر چکے ہیں بے سوچے سمجھے جو کام کیجئے اس میں نقصان کا اندیشہ زیادہ رہتا ہے ہمیں چاہئے کہ ہم دماغوں کو ماؤف نہ ہونے، اپنی آنکھیں بند نہ کریں۔ دلوں کے پٹ کھلے رکھیں۔ قدیم وجدید دونوں کا مطالعہ تعصب و نفرت اور مرعوبیت کے جذبہ سے خالی ہو کر کریں۔ جہاں بھی اچھی چیزیں پائیں اپنی میراث سمجھ کر اٹھالیں، جہاں بری چیزیں دکھائی دیں ان کو چھوڑ دیں۔ نہ اپنے اندر اتنا کبر کہ دوسروں کی کوئی چیز بھی معلوم نہ ہو ہم کو اپنی آنکھوں شہتیر بھی نظر نہ آئے اور دوسروں کی آنکھوں کے تنکے صاف جھلکتے ہوئے دکھائی دیں۔ نہ ایسی مرعوبیت ہو کہ اپنے جوہر کی قدر نہ کرسکیں اللہ کی نعمتوں کی تلاش داخل اور خارج دونوں میں ہونی چاہئے۔ اس کی نعمتیں کسی خاص قوم اور ملک میں محدود نہیں۔ ہر انسان کے اندر جوہر موجود ہے ہر انسان کے پیچھے شیطان بھی لگا ہوا ہے جو اس کو دھکے دے کر انتہائی گڑھے میں پہنچا دیتا ہے اس کی تمام خوبیاں خود اس کے ہاتھوں ضائع کرادیتا ہے۔ انسان اچھی باتیں بھی سوچتا ہے اور بری باتیں بھی وہ اچھے عمل بھی کرتا ہے اور برے عمل بھی پس ہمیں چاہئے کہ ہر قوم کی اچھی باتوں کی قدر کریں اور ان کو اپنائیں اور ہر قوم کی بری باتوں سے پرہیز کریں اور ان کو نہ اپنائیں اس کے لئے فکر کی طاقت کو بڑھانا اور تنقید کی قوت میں اضافہ کرنا ہوگا۔ اور تعصب و نفرت اور مرعوبیت جیسی ذلیل خاصیتوں کو چھوڑ دینا ہوگا اگر ہم ایسا نہیں کریں گے تو نتیجہ میں یا تو بہت سے محاسن سے محروم ہو جائیں گے اور ان کو کھودیں گے یا بہت قابل قدر باتیں جو دوسروں میں ہیں ان کو نہیں اپنائیں گے۔ کچھ کرنے سے پہلے

سوچ لیجئے نفرت نہ کیجئے، مرعوب نہ ہوجایئے۔ آپ میں جو اچھی باتیں ہیں ان کو مضبوطی سے تھامئے دوسروں میں جو اچھی باتیں ہیں انہیں خندہ پیشانی سے قبول لیجئے کسی چیز کو قبول کرنے کے لئے اتنا کافی نہیں کہ کوئی حرج نہیں ہے بلکہ اس کا ہمارے لئے مفید ہونا بھی ضروری ہے۔

دماغ کی دولت انسان کی سب سے قیمتی دولت ہے۔ اسے کند نہ کیجئے۔ زنگ آلودہ نہ کیجئے۔ قلب جسم انسانی میں بادشاہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسے تعصب تنگ نظری اور مرعوبیت کا شکار نہ ہونے دیجئے۔ تعصب و تنگ نظری اور مرعوبیت کی جو آگ ہم نے سلگائی تھی وہ آگ اب اپنوں کے خلاف سلگ رہی ہے۔ ہر مسلمان دوسرے مسلمان سے نفرت کر رہا ہے اور کسی قدر مشترک پر متحد ہونے کو تیار نہیں۔ جو مسلمانوں کا اتحاد عزیز رکھتے ہیں ان سے عرض ہے وہ محبت اور وسعت نظری کو اپنا شعار بنائیں اور جن امور پر اتحاد ہوسکے ان امور کو اہمیت دیں۔

الجزائر اور ہندوستان کے تجربات اقلیتوں کے لئے

الجزائر میں نوے لاکھ مسلمان اور دس لاکھ یوروپین تھے۔ مسلمان جاہل، غریب اور منتشر تھے۔ یوروپین علم و فضل میں سائنس اور حکمت میں، فن اور تجارت میں بہت ممتاز اور کامیاب تھے۔ الجزائر کی بہتر زرخیز زمین ان کے قبضہ میں تھی۔ دودھ کی نہریں بہتیں اور شراب کے جام گردش کرتے تھے۔ ان کی دو تہائی تعداد الجزائر کے صرف دو شہر "اوران" اور الجیر اور ان کے نواح میں رہتی تھی اس لئے بہت منظم بھی تھی یہ دونوں آبادیاں اپنے سج دھج کے لحاظ سے یورپ کی آبادیاں تھیں۔ یہاں ان کو مسلمانوں کی کوئی محتاجی نہ تھی۔ سڑکوں کو صاف کرنے والوں سے لے کر اونچے سے اونچے عہدوں تک یوروپین اقوام کے قبضہ میں تھے۔ ان کی عدم محتاجی نے ان کو تاریک بیں، تنگ نظر اور مغرور بنا دیا تھا۔ وہ نظریں اٹھا کر دیکھ نہ سکے کہ یہ دنیا کتنی بڑی ہے۔ انہوں نے سمجھا کہ جو کچھ دنیا ہے یہی ہے اور وہ اس دنیا کے خداوند

ہیں۔ ان کی خدائی میں کوئی شریک نہیں ہے۔ جب مسلمانوں نے آزادی کی تحریک شروع کی تو وہ غیض و غضب سے بھر گئے۔ ان کے جذبۂ کبر کو ٹھیس لگی۔ انھوں نے نعرہ لگایا الجزائر فرانس کا ہے۔ جب ڈی گال مطالبہ آزادی پر غور کرنے کی طرف مائل ہوئے تو مقامی فوجیوں نے بغاوت کردی خفیہ فوجی تنظیم قائم ہوئی۔ اس نے سیکڑوں اشتہارات کے ذریعہ یوروپین آبادی کو یقین دلایا کہ الجزائر پر فرانس کا قبضہ باقی رہے گا۔ یوروپین آبادی نے اس پر یقین کیا۔ وہ الجزائر کی مالک بن کر الجزائر میں رہنا چاہتی تھی۔ وہ جزائری کہلانے میں اپنی توہین سمجھتی تھی۔ اسے اپنے کولون ہونے اور یوروپین ہونے میں بڑا فخر تھا۔ اس نے مسلمانوں سے مصالحت نہیں کی۔ اس نے مسلمانوں کو دہشت زدہ کیا۔ بم کے دھماکوں سے ان کو تباہ کیا۔ ان کی عورتوں، بچوں اور جوانوں کو ہلاک کیا۔ وہ آبادی سمجھتی تھی کہ تشدد کے ذریعہ حق والوں کا حق سلب کیا جاسکتا ہے، غریبوں اور مزدوروں کو اکثریت میں ہونے کے باوجود، بیدار ہونے کے باوجود دبایا جاسکتا ہے، وقت کی رفتار کو بدلا جاسکتا ہے، عہد وسطیٰ کے اس دور کو لوٹایا جاسکتا ہے جبکہ سامراج کو انگریز کہا جاتا تھا لیکن جو مغالطوں میں رہتے ہیں وہ اپنا نقصان کرتے ہیں، تاریخ ان کے ساتھ رعایت نہیں کرتی، وہ ناسمجھوں کی پروا نہ کرکے اپنے صفحات الٹتی رہتی ہے۔ جو سمجھتے تھے کہ دو شہروں میں ان کی طاقت پورے ملک کی طاقت ہے، ان کے اقتدار کی حفاظت کی ضمانت ہے۔ انھوں نے آخر محسوس کیا کہ وہ غلطی پر تھے۔ الجزائر آزاد ہوگیا اور وہاں کی عظیم آبادی سے بے تعلق رہنے بلکہ دشمنی کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ یوروپین قوموں کو بری طرح فرار ہونا پڑا۔ اور وہ انتہائی محتاجی کے عالم میں دوسرے ملکوں میں پڑے ہوئے ہیں اور جو اپنی صلاحیتوں کے بنا پر آزاد الجزائر میں بھی عزت کا مقام حاصل کرتے وہ اپنی اہمیت کھو چکے ہیں۔

اس سے پہلے یہی حال ہندوستان میں بھی ہوچکا ہے۔ ہندوستان کا مسلمان اپنی سلطنت کھونے کے باوجود اپنی انفرادیت رکھتا تھا۔ تعلیم میں، معاش

میں ایسا برانہ تھا۔ اس کی ریاستیں بھی تھیں۔ اس کے راجے مہاراجے بھی تھے۔ اس کی بڑی زمینداریاں بھی تھیں۔ فوج میں، ریلوے میں، ڈاکخانہ میں یہ چالیس فیصدی پچاس فیصدی اور ساٹھ فیصدی کے تناسب میں تھا۔ مسلمانوں میں اچھے مدبر بھی تھے، اچھے صناع بھی تھے، اچھے تاجر بھی تھے۔ یہ ٹھیک ہے ہندوؤں سے بہت کم تھے لیکن تناسب آبادی کے لحاظ سے بہت زیادہ تھے۔ تہذیب و معاشرت اور دین کا تصور تو وہ تھا جن کی روشنی سے غیر مسلموں کی نگاہیں خیرہ ہو سکتی تھیں۔ اگر مسلمان اپنے اس تصور کو جس کے لئے وہ مکلف تھے، غیر مسلموں میں پہنچاتے اور ایک داعی امت بن کر رہتے اور ہندوستانیوں سے محبت کرتے تو ان کی افادیت محسوس کی جاتی اور آزادی کے بعد ان کا بڑا وقار ہوتا لیکن انہوں نے بھی کبر و غرور سے کام لیا۔ ہندوؤں سے ملنے کے نام سے ان کو غصہ آیا، انہوں نے تعصب و نفرت کو اپنا طریقہ بنایا، ہندوؤں سے الگ تھلگ رہے۔ اپنی حیثیت ایک ذات ایک فرقہ، ایک قبیلہ کی بنائی اور آپس میں بھی نفرت کرنے لگے۔ شیخ، سید، جلاہے دھنئے اور پٹھان وغیرہ کی تفریق ہوئی۔ انہوں نے یہ نہیں کہا کہ وہ ہندوستانی قومیت کے ایک ناقابل تقسیم عنصر ہیں، انہوں نے ہندوستان کی تعمیر میں بڑا حصہ لیا ہے اور آئندہ وہ اس کی تعمیر میں حصہ لینا چاہتے ہیں۔ بلکہ یہ کہا کہ الگ ایک قوم ہیں، ان کا جو اثاثہ ہے وہ ان کا اپنا اثاثہ ہے، اس میں ہندوستان کی دوسری قومیں شریک نہیں ہیں۔ وہ کسی حال میں ہندوستان کی دوسری قوموں سے نہیں مل سکتے۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ انھیں چھوٹی سی سلطنت علیحدہ دے دی جائے اور انہوں نے اصرار کیا کہ باقی حصہ میں ہندوؤں کی عظیم اکثریت کی سلطنت قائم کی جائے، مسلمان اس میں شریک نہ ہوں۔ مولانا آزاد وزیر بنائے گئے اور ذاکر صاحب صدر جمہوریہ ہوئے تو ان کو غصہ آیا کیونکہ یہ بات تقسیم کے نظریہ کے خلاف تھی۔ انہوں نے گمان کیا کہ ہندوستان نے دل سے تقسیم کو نہیں مانا ہے۔ پاکستان کو یہ بات گوارہ نہیں کہ پاکستان کے ہندوستانی سفارت خانہ میں ہندو بھیجا جائے۔ نتیجہ یہ ہو

کہ آزاد ہندوستان میں مسلمان میں اجنبی بن کر رہے غیر ہو کر رہے نہ صرف ہندوؤں نے ان کو غیر سمجھا بلکہ انہوں نے بھی اپنے کو غیر سمجھا۔ جو پاکستان جا سکے وہ پاکستان گئے جو نہ جا سکے انہوں نے سمجھا کہ انہیں دوسرے درجہ کا شہری بن کر رہنا ہے۔ ہاں کچھ لوگ اس تصور کے نہیں ہیں اور ہندوؤں میں بھی ایک طبقہ ہے جو مسلمانوں کو غیر نہیں سمجھتا لیکن ان کی تعداد کم ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ جو غیروں کے ساتھ سلوک ہوتا ہے وہ ان کے ساتھ ہو رہا ہے۔ ہندو ان کو اپنے اوپر بوجھ سمجھتے ہیں کیونکہ وہ ان کی افادیت سے واقف نہیں۔

ان واقعات سے یہ سبق ملتا ہے کہ علیحدگی پسندی فرد اور قوم دونوں کے لئے مہلک ہے جہاں رہو لوگوں میں مل کر رہو اپنی اچھی باتیں بہت پیار سے ان کو دو اور ان کی اچھی باتیں ممنون اور احسان مند بن کر قبول کرو۔ کبر سے خالی عاجز و منکسر بن کر اکرام آدم کی نبوی تعلیم پر عمل کر کے ہم وطنوں میں گھل مل کر رہئے اور اپنا دین صرف اپنے لئے نہ رکھئے بلکہ فیاضی کے ساتھ اپنے پڑوسیوں کو اس سے روشناس کیجئے۔

کسی ملک میں اقلیت زندہ اور باعزت رہنا چاہتی ہے تو یہی صورتیں ہیں۔ ہندوستان اور الجزائر کا تجربہ ایسا نہیں کہ ہم انہیں نظر انداز کر دیں۔
مسلمانوں کی ایک قلیل جماعت آزادی سے پہلے ایسا سوچتی تھی لیکن مسلمانوں نے اس کی آواز کو سننا پسند نہیں کیا بلکہ اس کو کمزور کرنے کے درپے ہوئے اس لئے اس کا خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا۔ ضرورت ہے کہ اب پوری مسلم قوم اس نہج پر سوچے۔

لکھنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سرکاسہ لیسی کی وہ عادت ہم اختیار کریں جو انگریزوں کے زمانہ میں کچھ لوگ اختیار کئے ہوئے تھے بلکہ لکھنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنی افادیت ثابت کریں اور کسی حال میں غیریت پیدا نہ ہونے دیں۔ ظلم کے خلاف بھی ہم کھڑے ہوں تو محسوس کیا جائے کہ ہندوستان کا ایک شہری کھڑا ہے اور ظلم

مذہبی کانفرنس دربھنگا (بہار)

دربھنگہ میں ۱۹۶۳ء کے اوائل میں، مذہبی کانفرنس ہوئی۔ بدھ مت، مسیحیت اسلام، کبیر پنتھی، ہندو دھرم وغیرہ کی نمائندگی ہوئی۔ مقرروں نے زور دیا کہ نفرت و عداوت کو ختم کرنا چاہئے۔ مذہب آپس میں بیر رکھنا نہیں سکھاتا ہے۔

یہ تو بالکل صحیح اور معقول بات ہے کہ مذہب آپس میں بیر رکھنا نہیں سکھاتا ہے یہ تو حکمراں طبقہ ہے جس نے ہمیشہ نفرت و عداوت کو بھڑکایا ہے۔ جب جب لوگ ٹکڑے ٹکڑے ہوئے ایک دوسرے کے دشمن بنے، ظلم اور جبر کا دور دورہ ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے پکارا۔ میرے راستہ پر آؤ۔ ہم تمہارے خالق ہیں، ہمارے یہاں تمہارے درد کی دوا اور تمہارے زخم کا مرہم ہے۔ ہم سے محبت کرو، ہماری مخلوق سے محبت کرو جس طرح ہم اپنی مخلوق سے محبت کرتے ہیں اور ان کی ضرورتیں پوری کرتے ہیں تم بھی ان کی ضرورتیں پوری کرو۔ سراپا محبت بن جاؤ۔ لاخیر فی من لایالف ولایؤلف (جس سے کوئی محبت نہیں کرتا اور جو کسی سے محبت نہیں کرتا اس میں کوئی اچھی بات نہیں ہے)، سب ایک اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو جاؤ۔ "واعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولاتفرقوا" قرآن میں نصاریٰ کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے کہ آؤ ہم تم اس پر جمع ہو جائیں کہ جو ہم میں تم میں متفقہ ہے۔ جب رائیں الگ الگ ہوں گی تو انسان بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا اور جب تقسیم ہو گا تو جھگڑا کرے گا۔ اس لئے ضرورت ہے کہ سب کو اخلاق سے اور محبت سے اور استدلال سے راستہ پر لایا جائے۔ دھوکہ دے کر، جبر کر کے، ناواقف رکھ کر ایک راستہ پر لانا لڑائی کی جڑ ہے۔ اس سے پرہیز واجب ہے۔ رجحانات مذہب کے بارے میں کئی ہیں۔ دین کی باتیں دوسرے سن لیں تو ان کے کانوں میں سیسہ پلا دو۔ دوسروں کا مذہب غلط ہے لیکن اس پر چلنے

والے اس کا حق نہیں رکھتے کہ اپنا مذہب بدلیں وہ اسی لئے ہیں کہ غلطی کریں، ذلیل ہوں اور انجام ان کا خراب ہو۔ دوسرا رجحان یہ ہے کہ سب ہی مذہب حق ہیں کسی پر چل کر اللہ تک پہنچ سکتے ہیں تبدیلی مذہب کی ضرورت نہیں جو اصلی تھا وہ بھی اور جو بدل گیا وہ بھی جو ایجاد ہوا وہ بھی۔ روز ایک نیا مذہب موجود۔ تیسرا رجحان یہ ہے کہ مذہب اصلی ایک ہے اور سب کو مذہب اصلی کی طرف لوٹنا چاہئے سب کو اسی کی دعوت دینا چاہئے رواداری سے، نرمی سے محبت سے جس کا دل قبول نہ کرے اس کو تنگ نہ کیا جائے، اس کو اذیت نہ دی جائے۔

پہلا رجحان ان کا ہے جنہوں نے سماج کی بنیاد نفرت پر رکھی ہے، جن کے عبادت خانوں میں ہریجن اور مسلمان نہیں جا سکتے۔ دوسرا رجحان ان کا ہے جنہوں نے اس خطرہ کا اندازہ نہیں کیا کہ صحیح غلط قدیم جدید ہر مذہب کا دروازہ کھلا رکھنے سے انسان انسان میں تفریق پیدا ہوگی۔ تیسرا راستہ اسلام کا ہے۔ وہ کہتا ہے سب کا راستہ ایک ہے امن و سلامتی محبت و خیر خواہی ایک اللہ کے آگے جھک جانا اسی کو اپنا مرکز ماننا۔ وہ کہتا ہے کہ جب بہکانے والوں نے انسان کو بہکایا اور ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تو اس کو ایک راستہ پر لانے کے لئے ہر قوم میں نبی اور رسول آئے اور آخری نبی اور رسول محمد صلعم تھے جو پہلے نبیوں کی تصدیق کرتے ہیں یعنی عیسےٰ موسےٰ وغیرہ اللہ کے فرستادہ تھے اور محمد صلعم وہی کہتے ہیں جو پہلے نبی اور پیشوا کہتے آئے ہیں اس لئے سب اس ایک دین پر جمع ہو جائیں جس کی دعوت ہمیشہ سے دی جاتی رہی ہے۔ مسلمان ہونے کی شرط یہ ہے کہ تمام انبیاء اور رسل پر یقین رکھا جائے کہ وہ سچے تھے۔ اور سچا دین اور ایک دین لے کر آئے تھے۔ ان کی دعوت میں اختلاف نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ لا اکراہ فی الدین (دین میں جبر نہیں ہے) جب تک ایک دین کی دعوت دلوں میں اتر نہ جائے اس وقت تک لوگ اپنے اپنے ادیان پر رہیں۔ لکم دینکم ولی دین۔ لوگوں کو ایک راستہ پر لانے کے لئے اور متحد و متفق کرنے کے لئے وعظ و نصیحت سے کام لیا جائے۔

آزادی کے بعد ہمارے ملک کا دستور لامذہبی بنیادوں پر بنا ہے۔ لیکن اقتدار کے سہارے کچھ لوگ ایک نیا مذہب تعلیم گاہوں کے ذریعہ ملک پر تھوپ رہے ہیں۔ یہ نیا مذہب ہندو مذہب تو نہیں ہے لیکن ڈھانچہ ہندو مذہب کا ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں اس طرح ملک میں اتحاد ہو جائے گا۔ ایک نئی قسم کی پرارتھنا ایجاد کی گئی ہے۔ اس میں سبھوں کی شمولیت لازمی ہوتی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اس طرح کی باتیں مناسب نہیں۔ ایک تو یہ کہ حکومت کو مذہبی معاملات میں دخل نہیں دینا چاہئے۔ اس کے اداروں میں اس طرح کی کوششیں نہیں ہونی چاہئے، صرف اس لئے نہیں کہ ایسی کوششیں دستور ہند کے خلاف ہیں بلکہ اس لئے بھی کہ جمہوری ملکوں میں حکومتیں بدلتی رہتی ہیں۔ اگر ہر حکومت نے اپنے رجحان کے مطابق دخل دینا شروع کیا تو مذہب ایک تماشا ہو جائے گا۔ ماضی میں سیاسی بنیادوں پر بڑی بڑی جنگیں ہوئی ہیں۔ کروڑوں آدمی گھائل ہوئے مارے گئے۔ ان لڑائیوں نے نفرت کے بیج ملکوں اور قوموں کے درمیان بودی ہے۔ وقتی مفاد کی بنیاد پر اہل سیاست کی حکمت عملی بدل جاتی ہے۔ وہ سیاسی مصالح کی بناء پر پسند اور ناپسند کا معیار بناتے اور بدلتے ہیں۔ اگر مذہب ان کے ہاتھوں میں دیا گیا تو اس میں جو استقرار اور دوام ہے وہ ختم ہو جائے گا اور کوئی مستقل قدریں کسی قوم کے پاس نہیں رہیں گی۔ ان کا رشتہ اپنے بزرگوں سے اتنا بھی نہ رہے گا جتنا رہنا چاہئے۔

بزرگوں میں محاسن بھی تھے اور انہوں نے غلطیاں بھی نہ کیں۔ اسلام کا کہنا ہے کہ محاسن کو معروف سمجھ کر اختیار کرو اور جو غلطیاں ہوئیں ان کو منکر سمجھ کر چھوڑ دو۔ دانشمند قوم اپنے بزرگوں کے تجربات سے فائدہ اٹھاتی ہے، یہی ہمارا ہمارے بزرگوں سے رشتہ ہے۔ ہزاروں برس کے انسانی تجربات نے کچھ قدروں کو مستقل بنا دیا ہے۔ انہیں عجلت میں نہیں چھوڑنا چاہئے۔ ہاں ایسا بھی نہیں ہونا چاہئے کہ ہم اپنے بزرگوں کو معصوم سمجھ لیں اور ان کی غلطیوں کو غلطیاں نہ سمجھیں اور انہیں بھی دین و مذہب کا جز قرار دیں۔ سابق میں ادیان اسی طرح بگڑے ہیں۔ اور ان لوگوں نے

کہا کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو جس پر پایا اسی پر قائم ہیں۔

سیاسی مزاج عجلت پسند ہوتا ہے اور یہ مذہب کے لئے اور انسان کے لئے بڑا خطرہ ہے۔ لہذا سیاسی حضرات مذہب ایجاد کرنے کی کوشش نہ کریں۔ ہم ابھی ہی کثرت مذاہب سے تنگ آتے ہوئے ہیں اگر وہ اس سے باز آجائیں تو ان کا ہم انسانوں پر بڑا احسان ہوگا۔ وہ تعلیم گاہوں میں ہر مذہب کی ٹھیک ٹھیک تعلیم دے دیں۔ اور یہ لوگوں پر چھوڑ دیں کہ وہ اپنی پسند کے مطابق جس مذہب پر چاہیں عمل کریں۔

افسوس ہے کہ مذہبی کانفرنس در بھنگہ نے نفرت و عداوت کی مخالفت تو کی لیکن نفرت و عداوت کے اسباب کا کھوج نہیں لگایا۔ اور اس کو پاٹنے کی کوئی تجویز نہیں رکھی۔

مذہبی اختلاف ہو یا سیاسی، ہم نفرت و عداوت کو دور کرنے کے لئے عدم تشدد کا ہی راستہ اختیار کر سکتے ہیں۔ ہم کسی کو مجبور نہ کریں، صرف ان کی عقل وخرد سے اپیل کریں۔ سب کو متحد کرنے کے لئے یہ نہ ہو کہ خیر و شر، سچ اور جھوٹ، شرک اور توحید کو گڈ مڈ کر دیں۔ بلکہ لوگوں میں سچائی کی تلاش کا جذبہ پیدا کرنا چاہئے۔ وہ خود عقل کی روشنی سے بزرگوں کے تجربات کی روشنی سے حالات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔

گاندھی جی نے ستیہ اور اہنسا کا نعرہ لگایا تھا۔ نفرت و عداوت کو دور کرنے کے لئے یہی نعرہ ہم بھی لگائیں اور سچائی پانے کے لئے مذاہب عالم کا تقابلی مطالعہ کریں۔ یہ نہ کریں کہ نیا مذہب ایجاد کر لیں۔ اس طرح موجودہ مذہبی فرقوں میں ایک نئے فرقے کی بنیاد رکھ دیں۔

ہندوستان کا محکمہ جاسوس

حکومت کے پاس ایک محکمہ ہے جس کا کام یہ ہے کہ وہ جرائم اور ملک دشمن سرگرمیوں کا پتہ چلائے۔ لیکن یہ محکمہ کس قدر اہل ہے اس بارے میں شری یتی رینو چکرورتی نے پارلیمنٹ میں لال بہادر شاستری آنجہانی کو جواب دیتے ہوئے کہا تھا کہ اس محکمہ کی اطلاعات عموماً غلط ہوئی ہیں۔ لیکن حکومت کی مصیبت دوسری ہے وہ اپنے محکمہ پر بھروسہ نہ کرے تو کس پر کرے۔ ذمہ دارانِ حکومت کو اقرار ہوگا کہ حکومت کے محکموں میں بد عنوانیاں ہوتی ہیں لیکن جب ان بد عنوانیوں کو دور کرنے میں کامیابی نہیں ہوتی تو اس کے سوا چارہ کیا ہے کہ جو ان کا محکمہ کہے اس کو مان لیں۔ اب اس میں لوگوں کا گلا کٹ جائے، فساد ہو جائے، بے قصور قید خانوں میں بند ہو جائیں تو مجبوری ہے ایک سڑے ہوئے انتظامیہ سے لوگوں کو جو تکلیف پہنچ سکتی ہے وہ پہنچے کی وہ پہنچے گی۔ یہ کوئی چھپی ڈھکی بات نہیں ہے کہ ہمارے جاسوس ہماری حکومت کو صحیح اطلاعات نہیں دیتے۔ اگر وہ صحیح اطلاعات دیتے تو گاندھی جی قتل نہ کئے جاتے، ملک میں اتنے بڑے بڑے فسادات نہیں ہوتے، آر ایس ایس کو اپنی سرگرمیاں تیز کرنے کا موقع نہ ملتا۔

قاضی احمد حسین مرحوم ام پی (کانگریس)، تبلیغی جماعت لے کر لوگوں کی اصلاح کے لئے دیہاتوں کی طرف جاتے تھے۔ ان دنوں حیدرآباد کے اتحاد المسلمین کا چرچا تھا اور یہ جماعت ہندوستان کے لئے مخدوش بنی ہوئی تھی۔ بس قاضی صاحب کے خلاف یہ رپورٹ تیار ہو گئی کہ ان کا تعلق اتحاد المسلمین سے ہے۔ قاضی صاحب کو معلوم ہوا کہ ان کے خلاف اس طرح کی رپورٹ ہے تو وہ سری کرشن سنہا وزیر اعلیٰ بہار سے ملے اور ان سے کہا کہ یا تو میں آپ کو اپنا سفر کا پروگرام بھیج دوں آپ اس موقع سے آجائیے اور دیکھئے میں کیا کرتا ہوں۔ آپ از خود ہمارے سفروں کا پتہ چلا تیے اور اچانک پہنچ کر دیکھئے کہ کیا ہو رہا ہے۔ سری کرشن سنہا نے کہا کہ آپ لوگوں کی زندگی تو ہمارے سامنے

ہے اس لئے کسی غلط رپورٹ پر میں کاروائی نہیں کر سکتا۔ ہمارا عملہ انگریزوں کے زمانہ کا ہے وہ ملک اور حکومت میں فرق نہیں کرتا۔ اور ہر پبلک سرگرمی سے اس کو تحاشا ہوتا رہے، اگر وہ کانگریس کی سرگرمی نہیں ہے۔

اسی طرح راقم الحروف نے منجھلے بھائی عبدالرحمٰن عثمانی جو کانگریس کی مخالفِ برطانیہ تحریک میں حصہ لے کر ایک سے زیادہ بار جیل گئے آزادی کے بعد معاشی بحران میں مبتلا ہو کر بیمار پڑے اور اپنے سسرال موضع بیلا تھانہ گوہ ضلع گیا میں جواب ضلع اورنگ آباد میں انتقال کر گئے اور وہیں مدفون ہوئے۔ وطن ان کا اسی ضلع کے موضع سملہ تھانہ رفیع گنج تھے۔ لیکن ان کے انتقال کے بہت بعد تک ہر سال ان کے وطن کی طرف پہنچ کر یہ معلوم کیا جاتا کہ وہ پاکستان سے آئے یا نہیں اور ہر سال علاقہ کے لوگ ان کو بتاتے کہ ان کا انتقال ہو گیا وہ کانگریسی تھے اور وہ کبھی پاکستان نہیں گئے۔

سندے ہوم منسٹر نے بنگال میں کانگریس کی شکست کے بعد ایک بیان میں کہا تھا کہ سی آئی ڈی کی الجھی ہوئی رپورٹ کی بنا پر انہوں نے بنگال کے کمیونسٹوں کے خلاف اتنے وسیع پیمانہ پر کارروائی کی تھی۔

اصل یہ ہے کہ حکومت کے عام محکموں کی طرح محکمۂ تفتیش میں بھی کارکنوں کے اندر احساس فرض نہیں ہے اور دوسری خرابیاں بھی ہیں اس لئے وہ جی لگا کر تفتیش نہیں کرتے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حکومت کے پاس ماہر فن نہ ہوں جس کی معذرت گاندھی جی کے قتل کے بعد سردار پٹیل نے پارلیمنٹ میں کی تھی لیکن اب آزادی کو اتنے برس گذر گئے کہ اس نقص کو دور ہونا چاہیئے۔ اگر یہ نقص دور نہیں ہو رہا ہے تو اس کا سبب اخلاقی گراوٹ کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ ضرورت ہے کہ اخلاقی مہم چلائی جائے اور بچوں کے نصاب میں بھی خلاقیات پر کتابیں ہوں تاکہ ملازمت میں آنے سے پہلے نوخیز نوجوانوں کا ذہن بنا رہے اور وہ سچائی اور ایمانداری کے ساتھ کام کرنے کا جذبہ لے کر ملازمتوں میں داخل ہوں۔

پاک وصاف انتظامیہ کے لئے پاک وصاف محکمۂ جاسوس بھی ضروری ہے۔

معاشی حالت کا اثر اخلاق پر

ابھی ۱۹۳۵ء کا دستور نافذ نہیں ہوا تھا کانگریسیوں نے اس وقت ایثار وقربانی کے جذبات کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس وقت کانگریسیوں کے لئے عمومی طور پر کمانے اور حاصل کرنے کے مواقع نہیں تھے۔ لٹانے اور برباد ہونے کا جذبہ ہر کانگریسی میں پایا جاتا تھا۔ اس حال پر ہر کانگریسی خوش تھا۔ اس کی جائیداد ضبط ہو جاتی وہ بے گھر کر دیا جاتا تھا، اس کے بچے بھوک سے بلکتے، اس کی عورتیں پھٹے کپڑوں میں رہتی تھیں پھر بھی وہ خوش رہتا تھا۔ وہ اپنے گھر اور اپنے خاندان کو اس طرح برباد اور بدحال کرکے سمجھتا کہ وہ کوئی بڑا کام کر رہا ہے۔ چنانچہ اس کی قربانیوں نے اسے تخت حکومت پر بیٹھا دیا لیکن جو پارٹی ایثار و قربانی کے اس بلند مقام پر فائز تھی وہ بہت جلد لالچ اور جلب منفعت کے اسفل مقام میں جا گری، اس قدر جلد کہ اس کی نظیر قوموں کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ اب جدھر دیکھئے لوٹ ہے، خوشامد ہے، رشوت ہے، جائز پر ناجائز کو ترجیح ہے۔ اب ایثار و قربانی کا نام و نشان نہیں۔ جب حکمراں طبقہ کا یہ حال ہے تو عوام کا کیا حال پوچھتے ہیں۔ مشہور ہے "الناس علی دین ملوکہم" (لوگوں کا دین اپنے بادشاہوں کے دین پر ہوتا ہے)۔ نتیجہ یہ ہے کہ رشوت، بلیک بازاری مال کی محبت، جان کی محبت، وقت کی ناقدری، فرض کا عدم احساس، کوئی برائی نہیں جس سے یہ قوم بچی ہوئی ہو۔ ہر طرح کے منصوبے بنتے ہیں، ہر طرح کے مضامین نصاب میں داخل ہیں لیکن نہیں ہے تو اخلاقیات کا منصوبہ اور اخلاقیات کی تعلیم۔

یہ سمجھا گیا تھا کہ معاشی حالت کے سدھر جانے سے اخلاقی حالت بھی سدھر جائے گی لیکن جن کی معاشی حالت بدلی ہے ان کی اخلاقی حالت نہیں بدلی ہے اخلاقی حالت بہتر ہوگی خدا ترسی سے، آخرت کے خوف سے اور مخلوق خدا کی محبت سے۔ جب ہم میں ہر وقت نیک باتوں کا چرچا رہے اور ہم بری باتوں کے انجام سے ڈرائے جائیں گے تو ہم سے یہ توقع رکھی جا سکتی ہے کہ ہم خود اونچے ہوں گے اور

اپنی قوم کو اونچا اٹھائیں گے۔ خود بری باتوں سے بچیں گے اور دوسروں کو بری باتوں سے بچائیں گے ورنہ ہماری عبادت بھی بے روح جادو اور سحر کی قسم کی چیز ہو کر رہ جائے گی

حکومت کے جتنے منصوبے ہیں، آخرت فراموشی اور خدا فراموشی کے منصوبے ہیں۔ اگر ہم دلوں پر بار بار دستک نہیں دیتے کہ دیکھو جو کچھ ہم کر رہے ہیں خدا دیکھ رہا ہے تو بہکانے والوں کا غالب آجانا یقینی ہے۔ اخلاقی ابتری سے جان مال کی محبت یقینی ہے اور جب جان و مال کی محبت پیدا ہو جائے تو ہم میدانِ جنگ میں کھڑے نہیں رہ سکتے کیونکہ وہاں جان دینے کا مطلب ہوتا ہے یا جان سے محبت کرو اور موت سے نفرت کرو یا موت سے محبت کرو اور جان دینے کے لئے تیار رہو۔

حکومت کو چاہئے کہ قوم کی اخلاقی حالت سدھارنے کی کوشش کرے۔

جرائم کیوں کر دور ہوں

روس کی خبر ہے کہ وہاں ایک شہر کے میئر کو اس جرم میں گولی مار دی گئی کہ اس نے رشوت لی تھی۔ بعض لوگ اس سزا کو نامناسب اور غیر معتدل قرار دیں گے اور اس سے یہ ثابت کریں گے کہ روس میں ظالمانہ نظام ہے۔ اسلام کے نظام تعزیرات پر بھی اسی طرح یورپ والے تنقیدیں کرتے رہے ہیں لیکن جو جرم کو دنیا سے ناپید کر دینا چاہتے ہیں وہ ایسی سخت سزاؤں کی قدر کریں گے۔ جن سے جرم کرنے کا تصور کرنے میں بھی رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔ اسلام نے سخت سزاؤں کے لئے شرطیں اور حدیں مقرر کر دی ہیں مثلاً یہ کہ اگر قحط کے دنوں میں چوری کی گئی ہو، غیر محفوظ شارع عام سے کوئی چیز اٹھالی گئی ہو تو ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ اسی طرح اگر شادی شدہ جوڑا نہیں ہے تو اس کو سنگسار نہیں کیا جائے گا۔ اسلام نے چار شادی تک کی اجازت اس حکمت سے بھی دی ہے کہ اگر شہوت زیادہ ہے تو ایک سے زیادہ شادی کر کے اس کی تسکین کرے لیکن اگر کوئی اس کے باوجود زنا کا مرتکب ہوتا ہے تو اس کا مطلب

ہے کہ وہ فساد پھیلانا چاہتا ہے اور لوگوں کی غیرت کو چیلنج کرتا ہے اس لئے واجب القتل ہے" الفتنة اشد من القتل" اسی طرح قتل کا جرم ہے۔ اگر مقتول کے ورثار خون بہا لے کر معاف کرنے کو تیار ہیں تو بدلہ میں قتل کرنے کا حکم نہیں ہے۔ اس طرح کی رعایتوں اور حدود کے بعد اسلام نے سخت سزاؤں کے نفاذ کا حکم دیا ہے۔ اس کا فائدہ دیکھنا ہو تو تاریخ کے اوراق الٹنے کی ضرورت نہیں ہے۔ سعودی عرب چلے جائیے، دیکھئے وہاں چوریاں نہیں ہوتیں، زنا کے واقعات نہیں ہوتے۔ شراب کی دوکانیں نہیں ملتیں، شراب کے بیچنے والے نہیں ملتے۔ سونا اچھالتے ہوئے دور دراز صحرا یا پہاڑوں کی وادیوں میں چلے جائیے، تنہائی میں ساری رات گزار لیجئے، کوئی پوچھنے والا نہیں تمہارے پاس کیا ہے۔ سڑکوں پر ایک نہیں ہزاروں لاکھوں موٹریں کھڑی رہتی ہیں۔ گیراج کا رواج نہیں لیکن کیا مجال کوئی موٹر غائب ہو جائے۔ ایسا بھی ہے مکانات کی دیواریں ٹوٹی ہوئی اور اندر کمپاؤنڈ میں چیزیں منتشر، لیکن کوئی اٹھانے والا نہیں اور یہ سب نتیجہ ہے اسلام کے نظام تعزیرات کے نفاذ کا۔

اسلام کے احکام سزا کو یہ کہہ کر ٹالا جا تا رہا ہے کہ یہ اگلے وقتوں کے قوانین ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ موجودہ وقت کی قومیں امن و امان سے محروم ہیں۔ امریکا جیسی مضبوط سلطنت میں رات کو نکلنا مشکل ہے۔ جدت پسند روس نے رشوت کے خلاف سخت سزا دے کر ایک نظیر قائم کی ہے اور اس کو اس کا فائدہ پہنچے گا۔ رشوت ایک ایسی بیماری ہے جو سرکاری ملازموں میں پیدا ہو جائے تو حکومت کا کوئی حکم صحیح طور پر نافذ نہیں ہو سکتا۔ رشوتوں کے خلاف اگر سخت قوانین بنا دیئے گئے اور ان کو نافذ کر دیا گیا اور ان کی افادیت بھی قوم کو سمجھا دی گئی تو حکومت کا کام بہت آسان ہو جائے گا اور اگر حکومت ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں ہے جو خدمت کا ذوق رکھتے ہیں تو کثیر فوائد پہنچیں گے۔

اسلام نے سزاؤں پر ہی اکتفا نہیں کیا ہے۔ بلکہ اس نے ترغیب و ترہیب سے بھی کام لیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تمہارے اعمال کا بدلہ صرف اسی دنیا میں نہیں

بلکہ آخرت میں بھی ملنے والا ہے۔ تم جرائم سے باز رہو گے فرائض حسن وخوبی سے انجام دو گے تو جنت کے پھل کھاؤ گے، اللہ کی رضا تمہیں حاصل ہوگی اگر جرائم کی طرف راغب ہو گے نفس کی بھوک تیز کرو گے تو اس دنیا کی سزا سے سخت سزا آخرت کی ہے۔ نار جہنم کے سزاوار بنو گے۔ اسلام اس آخری انجام سے ڈراتے ہوئے کہتا ہے تم جو کچھ کر رہے ہو خدا اسے دیکھ رہا ہے اور تم خدا سے کوئی چیز نہیں چھپا سکتے اس لئے آخرت میں خدا کا فیصلہ جھوٹ بول کر نہیں بدل سکتے پھر اس حد تک اسلام نے قناعت نہیں کی کہ خدا و آخرت کی خبر دے دی بلکہ اس خیال کو دلوں میں پیوست کرنے کے لئے پختہ تر کرنے کے لئے اس نے عبادت کا ایک نظام بنایا۔ روزانہ پانچ وقت کی نمازیں فرض کیں جن میں قرآن کی آیتیں بری باتوں کے انجام بد اور نیک عمل کے انجام خیر سے بھری ہوئی پڑھی جاتی ہیں۔ حکم اس ہے اس طرح پڑھو جس خدا تمہیں دیکھ رہا ہے۔ اس کے سامنے اپنے عجز کا اور اس کی قدرت کا اظہار کرو پھر عبادت میں بے رغبتی دور کرنے کے لئے جماعت کی نماز کی تاکید ہے تاکہ پورا ماحول انسان کی عبودیت کا پیدا ہو جائے اور اس کا کہ خدا بڑی قدرت والا ہے، انعام دینے والا اور سزا کرنے والا ہے۔ جس نظام عبادت کے ذریعہ ذہنوں میں یہ بات بٹھادی جاتی ہے کہ برائی پر سخت گرفت ہے اور ہم اس گرفت سے بچ نہیں سکتے۔ اسی نظام عبادت کے بارے میں یہ کہا گیا ہے "الصلوٰۃ تنھیٰ عن الفحشاء والمنکر" (نماز فحش باتوں اور بری باتوں سے روکتی ہے)۔

سزاؤں اور عبادات کے علاوہ سماج پر بھی یہ ذمہ داری ڈالی گئی ہے کہ وہ اپنے بھائی کو برائی سے روکے اور اس کو نیکی کی ترغیب دے۔ یہ تمام صورتیں اگر اختیار کی جائیں تو انشاء اللہ برائی کی صورتیں باقی نہیں رہیں گی۔ روس نے سخت سزاؤں کا تجربہ کیا ہے اسے چاہئے کہ ان بقیہ باتوں کا بھی تجربہ کرے۔

ہمارے ہندوستان اور پاکستان میں بھی طرح طرح کی اخلاقی خرابیاں ہیں۔ رشوتوں کا زور ہے۔ ادائیگی فرائض سے غفلت ہے، جرائم کی شدت اور وسعت کو دیکھئے

تو اقرار کرنا پڑے گا کہ ان ملکوں میں سزائیں ہلکی ہیں اور جرائم کی شدت سے مناسبت نہیں رکھتیں۔ پھر ان ہلکی سزاؤں سے بھی لوگ بری ہو جاتے ہیں۔ کچھ تو حکام میں رشوت کی وجہ سے اور کچھ وکلاء کی وجہ سے۔ حکومت کو چاہیئے کہ وہ منصوبہ بند طریقہ پر برائیوں کو مٹائے اور ملک کو بدنامی سے بچائے۔

گوا کے ایک واقعہ سے سبق

ہفتہ وار کرنٹ مورخہ ۱۳ اپریل ۶۳ء میں ایک پرانے واقعے کا ذکر ہے:
واقعہ یوں ہے کہ گوا پر حکومت ہند کا قبضہ ہوا تو اس کے ایک ماہ بعد ہندستانی فوجی کارو نامی صوبہ بہار کا ایک شخص کسی دوکان پر سودا لینے گیا۔ وہاں قیمت کے اتار چڑھاؤ پر جھگڑا ہوا۔ جس دوکان والے سے جھگڑا ہوا، کارو نے اس پر پتھراؤ کیا۔ کچھ طلبہ وہاں موجود تھے انہوں نے کارو کو گھیرے میں لے لیا اور پکڑ کر فوجی افسر کے پاس پہنچا دیا۔ اب کارو کے دوستوں کو انتقام کی سوجھی رات کے وقت دوکاندار کے گھر پہنچے۔ کھڑکی توڑی اور ایک بم دے مارا۔ اس بم سے چھت کے کچھ حصے اڑ گئے۔ کمرہ میں ایک ۱۳ سالہ لڑکی سو رہی تھی اس کے دونوں پیر کٹ گئے۔ گوشت کے ٹکڑے پاؤں سے چھوٹ کر کمرہ میں بکھر گئے۔ مقدمہ عدالت میں پہنچا۔
غور کیجیے، جمہوریت اور بادشاہت میں کوئی فرق۔ تاریخ پڑھیے، کوئی بادشاہ کسی ملک پر قبضہ کرتا تھا تو اس کی فوج مفتوح ملک کو لوٹتی تھی اور برباد کرتی تھی اور لوگوں کو طرح طرح سے اذیت دیتی تھی۔ وہاں مثال جمہوری ملک نے پیش کی۔ گوا میں مظالم کی خبریں اخبارات میں آئیں۔ کون گوا؟ جسے ہم اپنے ملک کا حصہ سمجھتے ہیں جس کے بارے میں ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ وہاں کے باشندے ہمارے ساتھ ہیں لیکن ہم نے ان کے ساتھ سلوک اغیار کا کیا ہے۔ کیا ایسی مثالیں پیش کر کے ہم ہر ملک کو اس پر آمادہ نہیں کریں گے کہ جب ہمارا حملہ ہو تو وہاں کے عورت مرد بچے سب

مل کر ہمارا مقابلہ کریں کیونکہ برباد تو یوں ہی ہونا ہے کیا اس صورت میں لڑائی آسان ہوگی؟

ایک زمانہ میں مسلمانوں نے بھی قیصر و کسریٰ سے جنگ کی تھی۔ ان کی جنگ کا یہ حال تھا کہ اگر کسی مصلحت سے عارضی طور پر کسی شہر سے ان کو ہٹنا پڑا تو وہاں کے باشندے آبدیدہ ہو کر کہتے تھے کہ خدا کرے یہ پھر آجائیں۔ یہ مسلمان ایک پیغمبر کے تربیت یافتہ تھے۔ ان پیغمبر کا یہ حال تھا کہ جب انہوں نے مکہ فتح کیا تو جو برسوں سے مسلمانوں سے لڑ رہے تھے ان کو مخاطب کر کے کہا تم سب کو معاف کیا۔ مابعد دوسری جنگ میں جانا پڑا تو بعض فوجی ان مفتوحین میں سے تھے۔ کامیاب لوٹے تو غنیمت کا مال ان کو زیادہ دیا تاکہ شکست کا جو زخم ان کو لگا ہے وہ مندمل ہو جائے اور فاتح اور مفتوح میں کوئی فرق باقی نہ رہے۔

کاش ہم سب ہندوستانی ہندو مسلمان سکھ عیسائی اتنا نہیں تو اس سے قریب تر صفات اپنے اندر پیدا کر لیتے۔ کام آسان ہے۔ صرف انتقام کا جذبہ دور کرنا ہے۔ عداوت کو ختم کرنا ہے، محبت کو بڑھانا ہے۔ سب انسان کو بھائی سمجھنا ہے۔ ملک میں اتنے منصوبے بن رہے ہیں کاش اس کام کے لئے بھی منصوبے بنتے ایسے پرچے اور رسالے حکومت کی طرف سے شائع ہوتے جن میں اعلیٰ اخلاق کی ترغیب ہوتی۔ مقالے پڑھے جاتے۔ سمپوزیم منعقد ہوتے۔ نصاب کی کتابوں میں اخلاق کی تعلیم لازمی ہوتی۔ تربیت کا خاص خیال رکھا جاتا۔

ہندوستان کو جس چیز کی ضرورت ہے، معلوم نہیں اس سے غفلت کیوں برتی جا رہی ہے۔

~~~~~~~~

عدم تشدّد

مہا بھارت کے عہد سے لے کر ۱۹۴۷ء تک اور اس کے بعد بھی ہندوستان کی تاریخ کشت و خون سے بھری ہوئی ہے۔ اس حالت میں جو کہتے ہیں "چھری اور
~~~~~~~~

چاقو سے بھی ڈرتا ہوں۔" وہ صحیح کہتے ہیں کیونکہ لڑنے والوں کے لئے اتنی چیزیں بھی کافی ہیں۔ ایسے ملک میں عدم تشدد پر زور دینا حکمت اور دانائی کی بات ہے۔

عدم تشدد کی بنیاد معاف کر دینے، محبت کرنے اور بھائیوں کے جذبۂ محبت کو ابھارنے اور للکارنے پر ہے۔ خوف اور بزدلی پر نہیں ہے۔ بزدلی سے تو تشدد بہتر ہے لیکن عدم تشدد اور بہادری دونوں جمع ہو جائیں، تو یہ سب سے بہتر ہے۔

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

بزدلی چھپانے کے لئے عدم تشدد کو ہمیشہ جائے پناہ نہیں بنایا جا سکتا ہے بزدلی کو چھپانے کے لئے تشدد کی حمایت بھی کی جاتی ہے۔ بہتوں نے چین کے خلاف لڑائی کی حمایت اس لئے نہیں کی تھی کہ وہ جارح تھا اور ان کی ہمت کہتی تھی کہ لڑنا چاہیئے بلکہ اس لئے کہ حمایت نہیں کریں گے تو غدار قرار دیئے جائیں گے۔ مسلم مخالف فسادات میں بہت نوجوان اس لئے شریک ہو جاتے ہیں کہ فسادی انہیں دھمکیاں دیتے ہیں۔

خدا کا شکر ہے کہ عدم تشدد کی حمایت میں آوازیں اٹھ رہی ہیں۔ جے پرکاش نرائن نے کہا کہ ہمیں بہادرانہ عدم تشدد کی لڑائی لڑنی چاہیئے۔ دشمن کے خلاف دلوں میں نفرت کو جگہ نہیں دینی چاہیئے۔ بعض کہتے ہیں کہ اگر وہ عدم تشدد کے حامی تھے تو پاکستان کے خلاف تشدد اور جنگ کا راستہ اختیار کرنے کی کیوں حمایت کی۔ اس کا جواب تو وہ خود دیتے لیکن اتنا تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے عدم تشدد کی حمایت کرنے میں غلطی نہیں کی۔ شانتی سینا سے سلامی لیتے ہوئے جب ہندوستانی جمہوریت کے نائب صدر نے حسرت سے کہا کہ ہندوستان اس قابل نہ ہو سکا کہ گاندھی جی کے نظریہ کے مطابق چین کے مقابلہ میں عدم تشدد کی لڑائی لڑ سکتا تو شانتی سینا کی خاتون کمانڈر نے ہمت اور یقین سے جواب دیا تھا کہ شانتی سینا سرحدوں پر عدم تشدد کی لڑائی لڑنے کو تیار ہے۔ ونوبا جی کی باتیں تو اخبارات

میں بہت کم آتی ہیں۔ اخبارات پر سرمایہ داروں کے قبضہ ہے وہ ایسی خبریں دیتے ہیں
جن سے اعصاب میں گرمی پیدا ہو جیسے ذبیحہ گاؤ ونوباجی بولتے ہیں کہ ذبیحہ گاؤ بند
کرو تو یہ خبر فوراً ملک کے طول وعرض میں پہنچادی جاتی ہے کیونکہ ایسا ہونے سے گوشت
اور چمڑوں کی تجارت پر جن کی اجارہ داری ہے مفلس ہو جائیں گے ان کے پاس
اتنا سرمایہ نہیں رہے گا کہ اگر وہ چاہیں تو دوسری اشیاء کی تجارت میں اپنا سرمایہ لگائیں اور
ان سرداروں کو چیلنج کریں جو ابتک بلا چیلنج زیادہ تر تجارت پر قابض ہیں۔ ونوباجی عدم تشدد
پر جو بولتے وہ اخبارات میں نہیں آتا

انسانی کمزوریوں کی وجہ سے کسی کو اس پر مجبور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ دشمن کی
دشمنی سے درگزر کرے۔ کمزوری یہ ہے کہ اس کو غصہ آتا ہے اس لئے وہ تشدد اختیار
کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں جو قوم تشدد اختیار کرتی ہے اسے بے لگام
نہیں چھوڑا جا سکتا۔ قرآن نے کہا ہے "واعفوا واصفحوا" (معاف کرو اور چھوڑ دو)۔
لیکن جب کافروں نے بہت ستایا، گھروں سے نکال دیا، ان کے املاک پر قبضہ کر لیا
جب مسلمان بہت دور جا کر مدینہ میں آباد ہوئے تو وہاں بھی ان کو چین سے نہیں رہنے
دیا گیا تو مسلمانوں میں خواہش ہوئی کہ لڑیں۔ ان کی بار بار خواہش ہوئی تو لڑنے
کی اجازت دی گئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہتھیاروں کو لے کر مسلمانوں کے
ساتھ اتر آئے اور جب کافروں کو مسلمانوں کی قوت کا احساس ہو گیا اور مسلمانوں کو
بھی تھوڑی کامیابیوں سے تسکین ہو گئی تو چند ہی چھوٹی چھوٹی حقیر جنگوں کے بعد
کافروں کی خواہش پر صلح کر لی اور کچھ دب کر ہی صلح کر لی۔ اس دب کر صلح کرنے
سے فائدہ یہ ہوا کہ کافروں کے دل میں جذبۂ انتقام نہ ابھرا جو جنگوں میں شکست کی وجہ
سے پیدا ہو سکتا تھا اور مسلمانوں کو اپنی بات پھیلانے کا موقعہ مل گیا۔ اسلام نے کہا
ہے "الصلح خیر" صلح کرنے میں بھلائی ہے۔ اس نے کہا ہے جس پر ظلم کیا جائے اس
کو بدلہ لینے کی اجازت ہے مگر اتنا ہی بھر جتنا ظلم ہوا۔ اس سے زیادہ نہیں۔ اور اگر
معاف کر دیا جائے تو یہ بڑائی کی بات ہے۔ عدم تشدد کے حامی جب میدان جنگ کی

کمان ہاتھوں میں لے لیتے ہیں تو جنگ محدود ہوتی ہے اور کم سے کم مضر ثابت ہوتی ہے اخلاقی اصولوں کو بھولنے نہیں دیا جاتا ہے۔ دشمن کے خلاف نفرت کا جذبہ ابھرنے نہیں دیا جاتا۔ جیسے ہی لڑائی ختم ہوتی ہے دشمن کو معاف کر دیا جاتا ہے جیسا کہ حضور صلعم نے فتح مکہ کے بعد کیا۔ جواہر لال آزادی کی لڑائی عدم تشدد کے ذریعہ لڑ چکے ہیں اس لئے ان کے دل میں انگریزوں کے خلاف نفرت کا جذبہ پیدا نہیں ہوا۔ خود اعتمادی البتہ پیدا ہوئی ان کو یقین ہوا کہ انگریزوں کا سہارا لئے بغیر وہ اپنے ملک کا نظم و نسق چلا سکتے ہیں۔

یہی جواہر لال چین کے خلاف لڑائی میں ہندوستان کے سربراہ تھے۔ انہوں نے کہا کہ چینیوں سے نفرت مت کرو انہوں نے مقصد امن کو واضح کیا جواہر لال پر تو اور بہت سی ذمہ داریاں تھیں۔ گاندھی وادیوں میں دوسرے لوگ تھے جو چین جا سکتے تھے اور کہہ سکتے تھے کہ ہم نہیں چاہتے کہ تجھ سے لڑیں تو پھر ہم پر گولیاں کیوں چلاتا ہے۔ افسوس یہ لوگ نہیں گئے یا تو ان کو نہیں سوجھی یا حکومت کے ذمہ داروں نے انہیں سہولتیں نہیں دیں۔ بہر حال عدم تشدد کی حمایت میں جو کچھ کہا گیا وہ غنیمت ہے خاص کر جب ہندوستان میں تشدد کے واقعات ہوتے رہتے ہیں۔

مسلمانوں کو ہندوستان میں تشدد سے بہت تکلیف پہنچی ہے۔ ان کے مال برباد ہوئے، ان کے بچے قتل ہوئے۔ ان کی عورتوں کی آبرو ریزی ہوئی۔ ان کو چین نصیب نہیں ہوا۔ ضرورت ہے کہ وہ اٹھیں اور برادران وطن میں عدم تشدد کا پرچار کریں

عدم تشدد کی سب سے پہلی لڑائی کی مثال تاریخ میں ہابیل قابیل کی ملتی ہے جن کا قصہ یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں کی مذہبی کتابوں میں ہے۔ جب ایک نے جوش حسد میں چاہا کہ دوسرے کو قتل کریں تو دوسرے نے کہا کہ تو مجھ کو قتل کرنا چاہتا ہے تو تجھ کو اختیار ہے لیکن میں تو اپنے ہاتھ انسان کے خون سے رنگ نہیں سکتا۔ یہ وبال بھی تجھ پر ہی رہے گا۔ میں اس سے پناہ مانگتا ہوں کہ اپنے بھائی کو قتل کروں۔ چنانچہ وہ قتل کر دیئے گئے۔

دوسری مثال نصیحت کی شکل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ملتی ہے۔ انہوں

نے کہا کہ تیرے ایک گال میں کوئی طمانچہ لگائے تو دوسرا گال پیش کر دے۔

تیسری مثال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی ہے۔ آپ کو آپ کے ساتھیوں کو بہت ستایا گیا۔ لوگ جان کے درپے ہوئے۔ عربوں کی رسم کے مطابق آپ کے ساتھیوں کے پاس تلواریں بھی ہوتی تھیں لیکن ایک مثال بھی نہیں ملتی کہ آپ نے یا آپ کے ساتھیوں نے جواب میں تلواریں چلائی ہوں۔ بس آپ صبر کی اور دین پر قائم رہنے کی تلقین کرتے رہے۔ مدینہ پہنچ کر لڑائی چھڑ گئی تو آپ نے اولین فرصت میں صلح کر لی اور جب کفار مکہ نے مسلمانوں کی حلیف قوم کے خلاف زیادتی کی تو آپ نے مکہ پر حملہ کیا لیکن جنگ ختم ہوتے ہی، اور جنگ بہت جلد ختم ہو گئی، آپ نے سبھوں کو معافی دے دی اور ان دشمنوں کے ساتھ بہت اچھا برتاؤ کیا۔ اور رسول اللہ صلعم کے ساتھ جنگ کی پوری تاریخ میں ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی کہ حضور نے اپنے ہاتھوں سے کسی کو قتل کیا ہو۔

چوتھی مثال حضرت عثمان غنی رضؓ کی ملتی ہے۔ یہ مسلمانوں کے تیسرے خلیفہ تھے حکومت کے تمام وسائل و ذرائع ہاتھوں میں خود بھی غنی خدام اور غلاموں کی کمی نہیں۔ مخالفوں نے ان کے مکان کا محاصرہ کر لیا لیکن حضرت عثمان نے اس کی اجازت نہیں دی کہ ان کی ذات کی وجہ سے کسی کا خون ہو وہ سمجھاتے رہے یہاں تک کہ قتل کر دیئے گئے۔

ظلم کے خلاف تشدد کی لڑائی باعث اجر و ثواب ہے لیکن تشدد نہ کرنا اور ظلم کو سہہ لینا زیادہ بڑائی کی بات ہے اور زیادہ اجر کا سبب ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارے ہندوستان میں جہاں لوگ جاہل اور پسماندہ ہیں، بات بات پر لڑ جاتے ہیں کرشن جی کی پریم کی بانسری ہی واحد علاج ہے۔ جبکہ ہندو لیڈر عوام کو عدم تشدد کے حامی نہیں بنا سکے، مسلمانوں کو چاہیئے کہ اٹھیں اور ہموطنوں کو عدم تشدد کا پیغام دیں۔

مذہب یا روٹی

سوامی وی ویکانند بڑے ہندو فلسفی گزرے ہیں۔ ۱۸۹۳ء میں انہوں نے شکاگو کا سفر کیا تھا۔ جہاں مذاہبِ عالم کی پارلیمنٹ ہو رہی تھی۔ اس پارلیمنٹ کو خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا:

"اے عیسائیو! جو باہر ملکوں میں مشنریوں کو اس لئے بھیجتے ہو کہ لوگوں کی روحانیت کی حفاظت کرو ان کو بھوک سے بچانے کے لئے کوشش کیوں نہیں کرتے؟ ہندوستان میں خوفناک کال ہوا ہزاروں آدمی بھوک سے مر گئے لیکن تم عیسائیوں نے ان کے لئے کچھ نہیں کیا۔ تم ہندوستان میں گرجا تعمیر کرتے پھرتے ہو لیکن مشرق میں جو برائی پھیل رہی ہے وہ مذہب کی محرومی نہیں، مذہب تو ان کے پاس بہت ہے بلکہ یہ روٹی ہے جس کے لئے جلتے ہوئے ہندوستان کے لاکھوں مصیبت زدہ سوکھے حلق والے آواز دے رہے ہیں۔ وہ روٹی مانگتے ہیں لیکن ہم انہیں روڑے دیتے ہیں۔ ایک بھوکے غریب انسان کی یہ توہین ہے کہ اسے حیات مابعد کے مسائل سمجھائے جائیں۔"

اس تقریر کو زمانہ بیت چکا ہے۔ حالات بدل گئے ہیں۔ ہندوستان میں عیسائیوں کی حکومت نہیں بلکہ جمہوری حکومت ہے جس میں غلبہ ہندوؤں کو حاصل ہے۔ صدر مملکت شری وی ویکانند کے ہم مذہب ہندو فلسفی شری رادھا کرشنن ہیں۔ عیسائی دنیا اربوں ڈالر ہندوستان کو معاشی ترقی کے لئے دیتی ہے لیکن کیا ہم اس کا صحیح مصرف لے رہے ہیں۔ پچاس فیصد بلکہ اس سے زیادہ ذرائع اور وسائل والے پونجی پتی اور ٹھیکیدار دبا لیتے ہیں۔ باقی کا وافر حصہ بھی ہماری غفلت شعاریوں کی نذر ہو جاتا ہے۔ ہم اپنے ملک کو سدابہار بنانے کے لئے جی لگا کر محنت نہیں کرتے۔ سارا

کام دھوکہ اور فریب کی بنیاد پر ہو رہا ہے۔ ہندوستان میں بیسیوں دواخانے ہیں جو جعلی دوا بنا رہے ہیں۔ دواؤں کا معاملہ بہت سنگین ہے۔ موت اور زندگی کا معاملہ ہے لیکن دوا ساز اس کی بھی پرواہ نہیں کرتے وہ ایسی دوائیں بیمار کو مہیا کر کے اس کی بیماری کو مستقل بنا رہے ہیں اور اس کو ہلاکت کی طرف لئے جا رہے ہیں اس ظالمانہ کارروائی کے خلاف کبھی کبھی حکومت کی طرف سے دھمکیاں بھی ملتی ہیں کبھی یہ بھی سنا جاتا ہے کہ پولیس نے دوڑ دھوپ شروع کر دی لیکن کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوتا یا تو رشوتوں کی قوت سے پولیس مرعوب ہو جاتی ہے اور حکام میں رشوتوں کا زور ہو تو حکومت کی مشنری ٹھیک سے کام بھی نہیں کر سکتی یا پولیس کا آہنی ہاتھ ان مسائل میں کسی دوسرے اسباب کی بنا پر موم کا ہاتھ بن جاتا ہے دواؤں کی بات تو بطور مثال پیش کی گئی غذاؤں کا بھی یہی حال ہے۔ آٹا خریدیئے تو اس میں پتھر پسے ہوئے ہیں، تیل خریدیئے تو اس میں ملاوٹ، گھی خریدیئے تو وہ غیر خالص۔ ارہر کی دال مانگئے تو کھساری کی دال حاضر ہے۔ چیزیں خراب ہیں تو اچھی کہہ کر دی جا رہی ہیں۔ کھانے باسی اور سڑے ہوئے ہیں تو تازہ کہہ کر دیئے جا رہے ہیں۔ غرض ہم اپنے ہاتھوں سے اپنا گلا دبا رہے اپنی منقاروں سے اپنے جال کا حلقہ کستے ہیں۔ آج دیویکانند ہوتے تو کتنے شرمندہ ہوتے کہ عیسائی دنیا آب حیات بھیج رہی ہے اور ہم اسے زہر میں تبدیل کر رہے ہیں قوم کا حال یہ ہو گیا ہے کہ نصیحت کیجئے تو برا مانتی ہے، دوست کو دشمن سمجھتی ہے۔ حکومت میں کچھ نیک ہیں تو ان کے گرد و پیش میں ایسے لوگ ہیں جو ان تک صحیح بات پہنچنے نہیں دیتے۔ صحیح بات دور سے بھی بلند ہونے نہیں دیتے کہ شاید کانوں تک پہنچ جائے۔ ہندوستان میں گھوم جایئے، اخلاقی ابتری موجود ہے۔ کوئی کسی پر بھروسہ نہیں کر سکتا۔ کسی سے مدد مانگئے تو وہ موقعہ پا کر پیٹھ میں چھرا گھونپ دے۔ وی ویکانند نے کہا تھا کہ ہندوستان کو مذہب کی ضرورت نہیں مذہب ان کے پاس بہت ہے لیکن اگر مذہب ہوتا تو ہم کو ایسا کیوں کرنے دیتا۔ ہم اس آبحیات کا صحیح مصرف لیتے جو امریکا سے بہتا ہوا آ رہا ہے۔

شاید ہماری بیماری یہی تھی کہ ہمارے پاس مذہب بہت تھے اور ہم اختلافِ مذہب میں پھنس کر رہ گئے۔ اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکے۔ ہم کوشش کرتے کہ جو سب سے اچھا مذہب ہو اس پر سب جمع ہو جائیں اور اس کی تلاش و جستجو پر قوم کو آمادہ کرتے تو ہمارا ملک بناسپتی گھی تیار نہ کرتا۔

ہندوستان کی قومیں

ہندوستان ایک ایسا چمن ہے جس میں طرح طرح کے پھول کھلے ہیں۔ جوہی بھی ہے، چنبیلی بھی اور گلاب بھی۔ یہاں کے میٹھے پانی، یہاں کی سہانی فضا، اونچے پہاڑ، یہاں کی سبز وادیاں سب دلوں کو موہنے والی اور یہاں کی تاریخ عظیم واقعات سے بھری ہے۔ شروع شروع یہاں ڈراویڈین کہتے تھے۔ ان کے عالیشان مکانات جو کھنڈروں میں ملے ہیں، ان کے مہذب ہونے کی شہادت دیتے ہیں۔ ان کے تعلقات دور دور ملکوں سے تھے اور بہت اچھے تھے۔ زمانہ ناہنجار نے ان کو ختم کیا۔ آریوں پر الزام کیوں دیجئے کہ انہوں نے ڈراویڈین کو ختم کیا۔ آریہ آئے تو ڈراویڈ کچھ جنگلوں میں چھپے کچھ شدر بنے اس ذلت کو قبول کرنے پر مجبور ہوئے۔ یہ آریہ انڈس اور گنگا کے کنارے آباد ہوئے۔ فن تعمیر سے لے کر فن سپہ گری، ادب و انشاء روحانیت، ریاضی ہیئت ہر صنف میں ان کے ہاتھوں ہندوستان مالامال ہوا۔ ارجن کے تیر، ترکش، کرشن جی کی بانسری، مہاتما بدھ کے وعظ، یہ سب تماشے ہندوستان کے آسمان نے دیکھے۔ پھر آریہ بھی کمزور پڑے، ٹکڑے ٹکڑے ہوئے۔ جس نے دنیا کو علم و ہنر دیا تھا، خود علم و ہنر سے محروم ہو گیا۔ اب مسلمان آئے۔ سارا دیس پھر ایک ہوا۔ کابل سے آسام تک، ہمالہ کی ترائی سے دکن تک ایک سیاسی اقتدار قائم ہوا۔ مسلمان بادشاہ اور راجپوت وزیروں نے مل کر حکومت چلائی۔ دنیا بھر سے حکمت و دانائی لے کر بڑے بڑے حکماء، اطباء، ادیب، خوشنویس

شاعر، صناع آگئے اور آباد ہوئے۔ ملک ایک ہوا تو ایک طرح سوچنے کی بنیاد پڑی۔ تاج محل بنا، مسلمانوں کی صناعی کا نمونہ۔ اجمیر ہندوستانی مسلمانوں کی روحانیت کا مرکز بنا، خواجہ معین الدین چشتی کا فیض عام ہوا۔ ان کے علاوہ بیسیوں صوفیار نے مئے روحانیت سے جام ہند کو لبریز کیا۔ شاہ ولی اللہ علم کے منار بلند بنے۔ انہوں نے وہ سوچا جو ان کے زمانہ میں دنیا میں کہیں کسی نے نہیں سوچا تھا۔ دولت سمٹ کر کچھ لوگوں کے قبضہ میں آجائے تو اس سے کیا خرابیاں پیدا ہوتی ہیں، ان سے پہلے کسی نے نہیں سوچا تھا۔ مسلم عہد میں پورب سے پچھم اتر سے دکھن تعلیم گاہیں موجود۔ رعایا مال و دولت سے بھری ہوئی۔ چور ڈاکو اچکے لٹیروں سے ملک مطمئن۔ اس دور میں کبیر داس، گرونانک اور غالب پیدا ہوئے۔ آریوں کے عہد میں ڈراویڈی شاعر اور مصلح نظر نہیں آتے۔ لیکن مسلم عہد نے بڑے بڑے غیر مسلم شاعر، سنت، فقیر، راجہ، جنگجو اور اہل علم پیدا کر دیئے۔ یہ ہندوستان کی رفتار تھی جو ہمیشہ آگے بڑھی جس نے ہمیشہ ترقی کی اور یہ ترقی اب تک تھمی نہیں ہے۔ اگر مسلمان فخر سے کہیں کہ انہوں نے ملک کی خدمت زیادہ کی ہے تو کس کو مجال انکار ہے۔ اس کے بعد انگریز آگئے۔ انہوں نے ہماری بہت سی کمزوریاں دور کیں۔ ہم کو بہت ساری اچھائیاں دیں۔ ڈراویڈ اور شدروں میں تعلیم پھیلائی۔ ایک قوم کا تصور دیا۔ مضبوط نظام حکومت دیا۔ کارخانے دیئے، ریلیں دیں، ڈاکخانہ کا بہتر محکمہ دیا۔ سائنس اور حکمت کی بنیاد ڈالی۔ اس ماحول میں گاندھی پیدا ہوئے، جواہر لال ہوئے، اقبال ہوئے، ٹیگور ہوئے، راجہ رام موہن رائے ہوئے، اینی بسنٹ، محمد علی جوہر، ڈاکٹر انصاری، علی امام، ابوالکلام آزاد وغیرہ نہ جانے کتنی شخصیتیں ابھریں۔ انگریزوں نے ہندوستان کو اپنا وطن نہیں بنایا۔ ملک چھوڑ کر چلے گئے۔ رہتے تو دعویٰ کر سکتے تھے کہ ہم اعلیٰ درجہ کے ہندوستانی ہیں۔ ہم نے ملک کو بنایا ہے تو اس سے انکار کون کر سکتا تھا؟

انگریزوں نے جو کچھ کیا، تنہا نہیں کیا۔ تنہا نہیں کر سکتے تھے۔ اتنے بڑے

ملک کو چلانا ملک والوں کے تعاون کے بغیر ناممکن تھا۔ مسلمانوں نے راجپوتوں اور کایستھوں کی مدد سے حکومت چلائی۔ انگریزوں نے ہندو مسلمانوں کی مدد سے۔ تجربہ ہوا کہ مل جل کر حکومت چلانے سے ترقی زیادہ ہوتی ہے۔ جب لوگ ایک دوسرے کو انگیز کریں تو کام زیادہ بنتا ہے اور ہر سمت میں ترقی معلوم ہوتی ہے۔ آریہ عہد میں شدروں کو حکومت میں شریک نہیں کیا گیا اس لیئے یہ حصہ ترقی کرنے سے رہ گیا۔ مسلمانوں نے آریوں کو شریک کیا تو آریوں نے بھی ترقی کی۔ انگریزوں نے سب سمت سے مدد لی تو سب سمت سے لوگ آگے بڑھے۔ لیکن کسانوں اور مزدوروں کی حالت بری رہی۔

انگریزوں کے آخر دور میں مسلم صوبوں کو علیحدہ کر دینے کا مطالبہ شروع ہوا۔ چنانچہ مسلم صوبے علیحدہ ہو گیئے۔ پنجاب بنگال کے ٹکڑے ہو گئے۔ ایک ہندوستان بنا دوسرا پاکستان۔ مسلم اکثریت کے علاقوں کی علیحدگی سے ہندوستان کے مسلمان کمزور ہو گئے۔ بہت موثر نہیں رہے لیکن پھر بھی رہے۔ جدید ہندوستان کی تاریخ بنانے میں مولانا آزاد وغیرہ کچھ مسلمانوں کا ہاتھ بھی تھا اس لیئے کچھ نہ کچھ اثر تو رہنا ہی چاہیئے تھا۔ اب اس دیس کا راج سب مل کر چلاتے ہیں۔ جبتک دہلی میں گاندھی جی کی سمادھی اور مولانا آزاد اور ذاکر حسین کی قبریں موجود ہیں کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ہندوستان کی حکومت میں سب قوموں کے نمائندے نہیں ہیں۔

۲۷ برسوں کی جدوجہد میں غریبی تو دور نہیں ہوئی لیکن ہندوستان خود کفیل ضرور ہو گیا۔ ہم اپنی سب ضرورت کی چیزیں پیدا کرتے ہیں۔ یہ فائدہ ہے مل جل کر کام کرنے کا۔ اب ہم کو کوشش کرنی ہے کہ ہمارے ملک میں جو انسان نما درندے ہیں وہ انسان بن جائیں۔ بلکہ انسان نما فرشتے بن جائیں۔ ارادہ چاہیئے۔ انشاء اللہ راستے بھی نکلیں گے پھر غریبی بھی دور ہوگی ویسے کسانوں اور مزدوروں کی حالت اب انگریزی عہد کے مقابلہ میں بہتر ہے۔

جدید عربی ادب

مولفہ :

محسن عثمانی ندوی اسسٹنٹ پروفیسر جواہر لال نہرو یونیورسٹی

(سابق مترجم، اناؤنسر عربک سکشن آل انڈیا ریڈیو)

چند اہم عنوانات

- ★ جدید مصر کی تاریخ
- ★ جدید عربی ادب میں دانشوری کی روایت
- ★ جدید عربی ادب اور مشہور صحافی
- ★ صحافت کے زیر سایہ عربی نثر کا ارتقاء
- ★ جدید عربی نثر کے معمار
- ★ جدید عربی شاعری
- ★ شعری اور نثری نمونے

عربی ادب کے ہر طالب علم کے لئے دستاویز۔

ہر صاحب ذوق قاری کے لئے ایک علمی تحفہ

جدید عربی ادب اور صحافت کا مفصل تعارف

عثمانی پبلشنگ ہاؤس۔ بی، ۱۲۱۔ ذاکر باغ۔ اوکھلا روڈ۔ نئی دہلی۔